ذوالقعدۃ, ذوالحجۃ
1427ھ 2006ء

خلافت
میگزین
علیٰ منہاج نبوت

((...ثم تکون خلافة على منهاج النبوة))

"... پھر خلافت علیٰ منہاجِ نبوت (نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت) قائم ہوگی" (مسند احمد)

مشرف کو کشمیر
پر غداری سے روکنا ہوگا

حزب التحریر کے پہلے امیر اور بانی
شیخ تقی الدّین نبہانی

مسلمانوں کی وحدت
بذریعہ خلافت یا بذریعہ او آئی سی

'بیکر ہملٹن رپورٹ'
عراق کی صورتحال کے متعلق حزب التحریر کا پمفلٹ

خلافت کا قیام
مسلمانوں پر فرض ہے اور اس سے غفلت برتنا حرام ہے

KHILAFAT
MAGAZINE

خلافت میگزین

عالمی منہاج نبوت

ذوالقعدۃ, ذوالحجۃ
1427ھ 2006ء

فہرست

- اداریہ 2
- درسِ قران الکریم 3
- درس حدیث 5
- مشرف کو کشمیر پر غداری سے روکنا ہوگا 6
- خلافت کا قیام - مسلمانوں پر فرض ہے اور اس سے غفلت برتنا حرام ہے 8
- مسلمانوں کی وحدت بذریعہ خلافت یا بذریعہ او آئی سی 14
- کفار کے الزامات کا معذرت خواہانہ جواب 17
- کیا فقہی اختلافات مسلمانوں کی وحدت میں رکاوٹ ہیں؟ 20
- شیخ تقی الدین نبہانی 23
- سیرت کے اوراق سے 25
- 'بیکر ہملٹن کمیشن رپورٹ' 28
- مشرف کی 'کچھ لو اور کچھ دو' پالیسی 31
- کیمرے کی آنکھ سے 33

❁❁❁

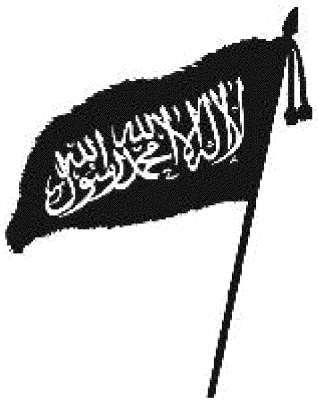

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حدیث نبوی ﷺ ہے:

''تمہارے اندر عہدِ نبوت موجود رہے گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اس کو ختم کر دے گا۔ پھر نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت قائم ہوگی جو (اس وقت تک) رہے گی جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کر دے گا۔ پھر موروثی حکومت کا دور ہو گا جو (اس وقت تک) رہے گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کر دے گا۔ پھر جابرانہ حکومت کا دور ہو گا جو (اس وقت تک) رہے گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کر دے گا۔ پھر نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت قائم ہوگی۔''

(رواہ احمد)

رابطہ اور مضامین بھیجنے کے لیے:
info.khilafat@yahoo.com
www.khilafat.pk

حزب التحریر کی ویب سائٹس:
www.hizb-ut-tahrir.info
www.hizb-ut-tahrir.org
www.khilafah.com

زرِتعاون: فی شمارہ 10 روپے
Published by:
'Shabab-ul-Umma'
Publications Lahore Pakistan

مشرف نے کشمیر پر حالیہ تجاویز امریکی ہدایات پر دی ہیں

صدر مشرف نے 5 دسمبر کو این ڈی ٹی وی کو انٹرویو کے ذریعے بھارت کو جو تجاویز پیش کیں ہیں اس حوالے سے بھارت کے سیاسی حلقوں میں کئی دن کی شدید بحث کے بعد 16 دسمبر کو بھارتی وزیراعظم منموہن سنگھ نے اعلان کیا کہ ''جہاں تک صدر جنرل مشرف کے چار نکاتی حل کا تعلق ہے تو جو بھی تعلقات کی نارمالائزیشن کی بات کرتا ہے ہم اس کی کوششوں کا خیر مقدم کرتے ہیں'' پھر 18 دسمبر 2006 کو پاکستان کے دفتر خارجہ نے اس بات کی تصدیق کی کہ اسے بھارت سے جواب موصول ہو چکا ہے۔ اور اس بات کی توقع کی جارہی ہے کہ جنوری 2007 میں بھارتی وزیر خارجہ اپریل میں 14 ویں سارک کانفرنس سے قبل دورہ پاکستان کے دوران کشمیر کے مسئلے کو زیر بحث لائیں گے۔

اگرچہ بھارت کے پاس تو وہ وجوہات موجود ہیں کہ جن کی بنا پر وہ صدر مشرف کی تجاویز کا گرمجوشی سے خیر مقدم کرے تاہم یہ مجوزہ حل چین اور اسلامی دنیا دونوں کے لیے بُرے نتائج کا عندیہ دے رہا ہے۔ کشمیر کے حل کا یہ فارمولا دراصل امریکی فارمولا ہے جیسا کہ موجودہ حکومت کی تمام اہم پالیسیوں کی صورتحال ہے۔ اس مجوزہ منصوبے کے خالق صدر مشرف نہیں بلکہ سابق امریکی صدر بل کلنٹن ہے۔ جس نے مارچ 2002 میں نئی دہلی کانفرنس سے خطاب کے دوران کشمیر کے تنازعہ کے متعلق یہ تجویز دی تھی: ''(کشمیر کے تنازعے) کو تقریباً انہی خطوط پر حل کیا جاسکتا ہے جن خطوط پر شمالی آئرلینڈ کے مسئلے کا حل نکالا گیا تھا'' اپریل 1998 میں برطانیہ اور آئرش ریپبلک کے درمیان شمالی آئرلینڈ کے متعلق تناؤ کو ختم کرنے کے لیے ''گڈ فرائڈے معاہدہ'' کا سب سے نمایاں پہلو متنازعہ علاقے پر دونوں فریقین کا مشترکہ کنٹرول تھا اور یہ امریکہ کی اس رہنمائی کے بعد ہی جنرل مشرف نے کشمیر پر بھارت اور پاکستان کے مشترکہ کنٹرول کی بات کو بار بار دہرانا شروع کیا۔

کلنٹن فارمولے میں، جسے کلنٹن کے دور میں تخلیق کیا گیا تھا، بھارت کی طرف جھکاؤ جھلکتا ہے۔ کلنٹن کے دور سے قبل کئی دہائیوں تک بھارت اور امریکہ کے تعلقات اگر منجمد نہیں تو سرد ضرور تھے۔ لیکن پھر 1998 میں کلنٹن کے دور میں بھارت اور امریکی عہدیداروں کے درمیان طویل ترین گفت وشنید ہوئی، پھر کلنٹن وہ پہلا صدر تھا جس نے پچھلے 20 سالوں کے دوران پہلی بار 2000 میں بھارت کا دورہ کیا۔ اس وقت سے واشنگٹن کی طرف سے بھارت پر کئی تحفے نچھاور کیے جارہے ہیں جن کا دائرہ تجارتی معاہدات سے لے کر توانائی کی قلت کے شکار بھارت کو باضابطہ طور پر ایٹمی طاقت تسلیم کرنے تک پھیلا ہوا ہے، جسے 18 دسمبر کو صدر بش نے قانونی حیثیت دے دی۔

بھارت کی طرف امریکہ کا جھکاؤ اس بات کو لازمی بناتا ہے کہ کشمیر پر یوٹرن لیا جائے اس جھکاؤ سے قبل امریکہ کشمیر پر کسی بھی دعوے کا انکار کرتا رہا ہے۔ اکتوبر 1993 میں امریکہ کے نائب سیکرٹری آف سٹیٹ رابن رافیل نے یہ بیان دیا تھا: ''ہم (امریکہ) کشمیر کے بھارت کے ساتھ باضابطہ قانونی الحاق کو تسلیم کرنے سے یہ مراد نہیں لیتے کہ کشمیر ہمیشہ کے لئے بھارت کا جزو بن گیا ہے۔'' لہٰذا امریکہ نے مسلسل کشمیر کے متعلق اقوام متحدہ کی تمام قراردادوں کی حمایت کی جو مسلم اکثریتی کشمیر کو صرف دو آپشن دیتی ہیں یعنی پاکستان کے ساتھ الحاق یا بھارت کے ساتھ الحاق۔ لیکن اس جھکاؤ کے بعد امریکہ نے اقوام متحدہ کی قراردادوں کو خیر باد کہہ دیا اور یوں کلنٹن فارمولا کے لیے راہ ہموار کی گئی۔ پس جولائی 2002 میں جنوبی ایشیاء میں امریکہ کی نائب سیکرٹری آف سٹیٹ کرسٹینا روکا نے کہا: ''...امریکہ اقوام متحدہ کی تمام کوششوں کی حمایت کرتا رہا... لیکن 1972 میں پاکستان اور بھارت ایک (شملہ) معاہدے پر پہنچ گئے کہ کشمیر دوطرفہ معاملہ ہوگا''

کلنٹن فارمولے کے لیے بھارت کے حلقوں میں پزیرائی حاصل کرنا ایک لازمی امر تھا۔ مشترکہ کنٹرول کے ذریعے بھارت کو آزاد کشمیر میں نئے سرے سے اتھارٹی دینا اور اس کے ساتھ ساتھ بھارت سے کشمیر کی آزادی کا انکار کر کے مقبوضہ کشمیر پر بھارت کے تسلط کو تسلیم کرنے سے بھارت کو اپنا خواب پورا ہوتا نظر آرہا ہے۔ بالخصوص اس صورتحال میں کہ جب وہ پاکستان کے ساتھ تین جنگیں لڑنے اور کشمیر کے مسلمانوں کو چھ دہائیوں تک سختی سے کچلنے کے باوجود وہ ایسی شرائط پر آمادگی حاصل نہیں کر سکا تھا۔

امریکہ کا بھارت کی طرف جھکاؤ ایک فطری عمل ہے اور کلنٹن کا فارمولا چین اور مسلمانوں پر گہرے اثرات مرتب کرے گا۔ کیونکہ امریکہ یہ چاہتا ہے کہ بھارت کو خطے میں علاقائی قوت بنا دے تاکہ اس کے ذریعے چین اور مسلمانوں کو محدود کیا جاسکے، کیونکہ چین کے مضبوط طاقتور بن کر ابھرنے کو سوویت یونین کے ساتھ مسابقت نے محدود کر دیا جو کیمونسٹ بلاک کی قیادت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تاہم سوویت یونین کے انہدام کے بعد چین مغربی اقتصادی مفادات کے لیے بڑھتا ہوا خطرہ بن چکا ہے۔ اس لیے بھارت کو مضبوط کرنا ضروری ہے تاکہ وہ چین کو محدود کرنے کے لیے ایک فصیل کا کام دے سکے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو جنوبی ایشیاء آدھے ارب سے زائد مسلمان اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، جن کا وسط ایشیاء اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں سے فطری تعلقات ہیں اور یہ دونوں خطے توانائی کی دولت سے مالا مال ہیں۔ اسلام کا ایک ایسی قوت بن کر ابھرنا جو مسلمانوں کو متحد کر دے، امریکہ کے سیاسی حلقوں میں انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ نومبر 2004 میں ہندوستان ٹائمز کی leadership initiatives conference سے خطاب کرتے ہوئے امریکہ کے سابقہ سیکرٹری آف سٹیٹ ہنری کسنجر نے بھارتیوں کو خلافت کے قیام کی شکل میں بنیاد پرست اسلام کے ابھرنے سے متنبہ کیا تھا۔ بلاشبہ خلافت جو کہ اسلام کا نظام حکومت ہے مسلمانوں کو ایک جسم کی شکل میں دیکھتی ہے جن کے درمیان کوئی سرحدی لکیریں موجود نہ ہوں، ایسی خلافت امریکہ کے عزائم کے لیے شدید دھچکا ثابت ہوگی۔

اس پس منظر میں مضبوط پاکستان امریکہ کو گوارا نہیں اور پاکستان اور کشمیر کا یکجا ہو جانا امریکہ کے لیے قابل قبول نہیں اور اسی پس منظر میں مشرف کا ڈھٹائی کے ساتھ امریکی ہدایات کو پورا کرنے، انڈیا کے سامنے جھک جانے کی اور اپنے اندر موجود استطاعت کے انکار کرنے کی پالیسی بعید از عقل ہے۔ ☆☆☆

درسِ قرآن الکریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ﴾ ''اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلائیے اور اسے بہترین طریقے سے گفتگو کیجئے، یقیناً آپ کا رب اپنی راہ سے بھٹکنے والوں کو بخوبی جانتا ہے اور وہ رہ یافتہ لوگوں سے بھی پورا واقف ہے'' (النحل:125) مزید ارشاد ہے: ﴿وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَھْلَ الْکِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ﴾ ''اور تم اہل کتاب کے ساتھ بحث ومباحثہ نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں'' (العنکبوت:46) اور موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اِذْھَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی . فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی﴾ ''تم فرعون کی طرف جاؤ۔ بے شک وہ سرکش ہوگیا ہے۔ اور تم دونوں اس کے ساتھ نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کے وہ نصیحت پکڑے یا ڈر جائے۔'' (طٰہٰ:44-43)

مندرجہ بالا آیات اس انداز کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں جس انداز سے ہمیں اللہ کی راہ کی طرف دعوت دینی چاہیے، پہلی اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ دعوت اللہ کے لیے ہونی چاہے نہ کہ کسی شخصیت، گروہ یا جماعت کے لیے۔ ایک داعی اُس ذمہ داری کو پورا کرتا ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس پر عائد کی ہو۔ وہ دعوت سے اور ان لوگوں سے، جو اس دعوت کے ذریعے حق کی طرف رہنمائی حاصل کرتے ہیں، کسی قسم کے فائدے کی توقع نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ دعوت کا اجر صرف اللہ کی طرف سے ہے۔ لہٰذا اگر لوگ اس کی دعوت کی طرف نہ آئیں تو وہ نہ تو غم زدہ ہوتا ہے اور نہ ہی مایوسی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور نہ ہی وہ ان سازشوں پر غضب ناک ہوتا ہے جو اس کے اور دعوت کے خلاف کی جائیں۔ کیونکہ ہدایت اور گمراہی اللہ کی طرف سے ہے جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا:

﴿لَیْسَ عَلَیْکَ ھُدٰھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾

''(اے نبی ﷺ) ان کو ہدایت پر لا کھڑا کرنا آپ کے ذمہ نہیں بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے''

(البقرۃ:272)

اور ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْھِمْ وَلَا تَکُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ﴾

''اور (مشرکوں) پر غم نہ کھاؤ جو چالیں یہ چل رہیں ہیں اُن پر دل گرفتہ مت ہو'' (النحل:127)

غیر مسلموں کو دعوت انہیں اسلام کی طرف مائل کرنے کی ہوگی۔ اس دعوت کو ہر دور میں انفرادی طور پر لوگ بھی سرانجام دیتے رہے ہیں جبکہ ریاست اسے عملی طور پر سرانجام دیتی ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ غیر مسلموں پر اسلام نافذ کیا جائے تاکہ وہ اسلام کے نور کو واضح طور پر دیکھ لیں تاکہ وہ گروہ در گروہ اللہ کے دین میں داخل ہو جائیں۔

جبکہ مسلمانوں کو دعوت ایسے دی جائے گی کہ وہ اسلام پر عمل کریں اور اسلام کے لیے جدوجہد کریں۔ ایسی حکومت کی غیر موجودگی میں، جو اسلام کے احکامات کی کو نافذ کرتی ہے، اس دعوت کا ہدف قرآن اور حکومت کو یکجا کرنا ہونا چاہیے۔ یعنی حاکمیت قرآن کو حاصل ہو اور اسلام کے احکامات لوگوں پر نافذ ہوں۔ اس کے معانی یہ ہیں کہ قانون کا ماخذ ایک ہی ہو جو کہ اسلام ہے۔ یہ دعوت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ ایک اجتماعی دعوت ہو یعنی ایک جماعت کی شکل میں۔ دعوت کی مندرجہ بالا دونوں اقسام کو سرانجام دیتے وقت اس بات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ اس کے عملی نتائج پیدا ہوں۔ ایک شخص کو دعوت سے متعلق اعمال صرف اس لیے سرانجام نہیں دینے چاہئے کہ اس کے سر سے گناہ اتر جائے یا وہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے حجت پیش کردے۔ بلکہ اسے ایسا کوئی عمل سرانجام دیتے وقت قابل محسوس نتائج کا تعین بھی کرنا چاہیے تاکہ اس فرض کے اصل مقصد کو پورا کر سکے۔ قابل محسوس نتائج کی مثالیں یہ ہیں کہ وہ کسی کو اسلام پر قائل کرے یا کسی شخص یا گروہ کے افکار کو تبدیل کرے یا جنگ کے دوران قلعہ کو فتح کیا جائے یا دشمن کی طاقت کو منتشر کیا جائے یا دشمن کے کسی علاقے پر قبضہ کیا جائے۔ کیونکہ صرف دعوت کرنا فرض نہیں بلکہ نتیجے کی طرف پیش رفت ہونا بھی ضروری ہے جو دعوت کا اصل مقصد ہے۔

جہاں تک دعوت کے انداز کا تعلق ہے تو شروع میں بیان کی گئی آیات تین اہم اسالیب کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں:

اول: ﴿بِالْحِکْمَةِ﴾ جس کا مطلب حکمت کے ساتھ دعوت دینا ہے، یعنی عقلی دلائل پیش کئے جائیں، حجت قائم کی جائے اور دوسرے کی عقل کو قائل کیا جائے اور غلط فکر کے مقابلہ میں صحیح فکر پیش کی جائے۔ ایک سوچنے والے شخص کے سامنے جب غلط فکر کے مقابلہ میں صحیح فکر پیش کی جاتی ہے تو وہ ان دونوں کا موازنہ کرتا ہے اور غلط فکر کے باطل ہونے کو پہچان جاتا ہے۔ لہٰذا سوچنے والوں کے لیے یہ طریقہ نتیجہ

خیز ہوتا ہے اور کفار اور اللہ کے منکر دعوت کے اس انداز سے خوف کھاتے ہیں۔ اور اسی طرح ایسے گمراہ لوگ جو چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی گمراہ ہو جائیں وہ بھی اس فکر سے خائف رہتے ہیں کیونکہ دعوت کا یہ انداز باطل کے باطل ہونے کو بے نقاب کر دیتا ہے اور حق کے حق ہونے کو ظاہر کر دیتا ہے۔ نتیجتاً یہ انداز ایک آگ بن جاتا ہے جو گمراہی کو جلا دیتی ہے اور ایسا نور ہوتا ہے جو نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن ایسی قطعی اور مدلل گفتگو کرتا ہے جو عقل کو قائل کرتی ہے۔ اور یہ انسانی ذہن کو مخاطب کرتا ہے کہ وہ اس کی آیات میں غور وفکر کرے اور زمین اور آسمان پر نظر ڈالے اور اس فکر وتدبر کے ذریعے اس نتیجے تک پہنچے کہ اس کائنات کا ایک خالق موجود ہے جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا، ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ. وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ. وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ. وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ﴾

''بھلا یہ نہیں دیکھتے کہ اونٹ کیسے پیدا کیا گیا؟ آسمانوں کو کیسے بلند کیا گیا؟ اور پہاڑ کیسے کھڑے کیے گئے؟ اور زمین کو کیسے ہموار کیا گیا؟''

(سورۃ الغاشیہ:17تا20)

اور مزید ارشاد ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾

''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، رات دن کے ادل بدل کر آنے جانے میں، اور ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کے لیے سمندروں میں دوڑتی پھرتی ہیں، اور اس بارش کے پانی میں جسے اللہ تعالیٰ نازل کرتا ہے کہ جس سے زمین مردہ (بنجر) ہونے کے بعد نئی زندگی حاصل کرتی ہے، جس کی وجہ سے چوپائے زمین پر پھیلے ہوئے ہیں، اور ہواؤں کے ہیر پھیر میں اور بادلوں کے آسمان اور زمین کے مابین مسخر رہنے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں'' (سورۃ البقرۃ: 164)

دعوت کے اندر حکمت اختیار کرنے سے مراد یہ نہیں کہ لچک پیدا کی جائے یا خوشامد کا انداز اختیار کیا جائے۔ نہ ہی اس سے مراد یہ ہے کہ اعتدال پسندی یا ڈپلومیسی اختیار کی جائے یا آہستہ آہستہ پیش رفت کی جائے۔ مندرجہ بالا میں سے کسی چیز کا بھی دعوت سے کوئی تعلق نہیں۔ حکمت سے مراد امور کو اُن کی صحیح جگہ پر رکھنا ہے، جس سے مراد ہے برہان یا دلیل۔ قرآن کی آیات میں اس بات کی کوئی گنجائش موجود نہیں کہ حکمت کی تفسیر ''امور کو اُن کی صحیح جگہ پر رکھنا'' کے علاوہ کچھ اور کی جائے، لہٰذا حکمت کے معنی برہان یا دلیل کے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے جب اسلام کی دعوت دی تو آپ ﷺ نے نہ تو مکہ کے لوگوں کی خوشامد کی اور نہ ہی ان کے ساتھ سمجھوتہ کیا۔ بلکہ آپ ﷺ اُن کے سامنے ان آیات کی تلاوت فرمایا کرتے تھے جن میں ان کے باطل عقائد کی نفی تھی جیسے:

﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ﴾

''یقیناً تم اور وہ سب جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں اور تم اس میں داخل ہو کر رہو گے''

(الانبیاء:98)

اور آپ وہ آیات بھی تلاوت کیا کرتے تھے کہ جن میں اس وقت کے سرداروں کا محاسبہ تھا جیسے:

﴿تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾

''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ تباہ ہو جائے'' (اللھب:1)

اور جیسے:

﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِیْنٍ. هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِیْمٍ. مَّنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ مُعْتَدٍ اَثِیْمٍ. عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِیْمٍ﴾

''لیکن تم ہرگز کسی ایسے شخص کا کہنا نہ ماننا جو بہت قسمیں کھانے والا، ذلیل، طعنے دینے والا اور چغلیاں کرتے پھرنے والا، بھلائی سے روکنے والا، حد سے بڑھ کر یہ کہ وہ بے نسب (زانی کی اولاد) بھی ہے''

(القلم:13-10)

دوم: فرمایا ﴿وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ اس سے مراد خوبصورت نصیحت ہے یعنی ذہن کو مخاطب کرتے وقت جذبات کو متاثر کیا جائے اور جذبات کو مخاطب کرتے وقت ذہن میں فکر پیدا کی جائے۔ اس انداز سے دعوت دلوں میں نرمی سے داخل ہوتی ہے اور شائستگی کے ساتھ جذبات کو مزید پختہ کیا جاتا ہے۔ گفتگو میں نرمی اکثر اوقات راغب دل کو رہنمائی بخشتی ہے اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتی ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ﴾

''اللہ کی رحمت کے باعث آپ ﷺ ان کے لیے نرم دل ہیں۔ اور اگر آپ ﷺ بدزبان اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ پس آپ ان سے درگزر کیا کریں اور ان کے لیے مغفرت طلب کیا کریں اور معاملے میں ان سے مشورہ کیا کریں'' (آل عمران:159)

اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اِذْهَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی. فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی﴾

''تم فرعون کی طرف جاؤ۔ بے شک وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اور تم دونوں اس کے ساتھ نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کے وہ نصیحت پکڑے یا ڈر جائے''

(طٰہٰ:44-43)

اسی طرح عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ نرم ومہربان ہے اور تمام چیزوں میں نرمی کو پسند کرتا ہے'' (مسلم نے اس حدیث کو روایت کیا)

اس کے علاوہ قرآن میں ایسی کئی آیات وارد ہوئی ہیں جن میں ﴿وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ کا اسلوب

اختیار کیا گیا ہے، جو انسان کے جذبات کو متاثر کرتی ہیں تا کہ روحوں کو جھنجوڑا جائے اور حالات کو دوبارہ ذہن میں لایا جائے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾

''کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، حالانکہ اللہ سے اچھا فیصلہ کرنے والا اور کون ہے؟ یہ بات ایسی قوم کے لئے ہے جو یقین رکھتی ہے۔'' (المائدۃ:50)

سوم: فرمایا ﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ ''اور مباحثہ کرو لوگوں سے ایسے طریقے سے جو بہترین ہو'' یعنی مباحثہ کے طریقوں میں سے جو بہترین طریقہ ہو، مطلب مباحثہ کرنے والا اس طریقے سے مباحثہ کرے جو مباحثہ کے شایان شان ہو۔ اور اس کی حدیں پار کر کے ذاتیات پر نہ اتر آئے بلکہ سچے دلائل پیش کرے اور باطل نقائص بیان کرے اور حق کو واضح کرنے کی کوشش کرے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾

''اگر آسمان وزمین میں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور بھی معبود ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو جاتے پس اللہ تعالیٰ عرش کا رب (ہر) اس وصف سے پاک ہے جو یہ مشرک بیان کرتے ہیں'' (الانبیاء:22)

اور ایک اور جگہ عقلی دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾

''کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یقیناً اس میں بہت کچھ اختلاف پاتے'' (النساء:82)

داعیان دین کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جب بھی کسی خاص شخص کو دعوت دیں تو اس سے پہلے دعوت کے مقصد کا تعین کر لیں اور اس بات کی حد بندی بھی کر لیں کہ وہ اس شخص سے گفتگو کس سطح تک یا درجے تک کریں گے۔ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ ہم کسی شخص سے مباحثے کا ہدف یہ رکھتے ہوں کہ اسے دعوت کے ذریعے مکمل طور پر اسلام کے رنگ میں ڈھال لیں گے تا کہ وہ خود بھی اسلام پر مکمل طور پر عمل درآمد کرے اور دیگر افراد کو بھی دعوت دے۔ یعنی وہ بھی داعی بن جائے۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے شخص سے ہمیں صرف اتنی امید ہو کہ وہ اسلام سے متعلق اپنے ذہن میں غلط فہمیوں کو دور کرے گا اور درست تصورِ دین اپنا لے گا۔ کسی تیسرے شخص سے ہماری توقعات کچھ مختلف بھی ہو سکتی ہیں مثلاً یہ کہ وہ اسلام کا درست مفہوم اپنی خاص محافل ومجالس تک لے جائے گا اور ان محفلوں میں صحیح فہم کو عام کرنے کا باعث بنے گا۔ جبکہ کسی چوتھے شخص سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ ہمارے دین کے کاموں میں مدد کرے گا اور داعیان دین کے ہاتھ مضبوط کرنے کا باعث بنے گا۔ دراصل داعی اپنے مخاطب سے جو توقعات رکھتا ہے ان کی حد بندی اور یقین اس لیے بہت ضروری ہے تا کہ بعد ازاں وہ مایوسی یا ملال کا شکار نہ ہو جائے۔

مایوسی اور ملال ہونا یقیناً صحیح نہیں کیونکہ دعوت پہنچانے کا مقصد مباحثہ یا مجادلہ میں برتری حاصل کرنا نہیں ہوتا اور نہ ہی داعی کو اس مباحثے میں مدمقابل پر غلبہ پانے کی خواہش رکھنی چاہیے۔ کیونکہ اس کا مقصد حجت تمام کرنا اور حق کو منکشف کرنا ہوتا ہے۔ دراصل انسانی نفس کی خصوصیات میں سے ایک غیرت وحمیت اور خودی بھی ہے۔ چنانچہ کسی بھی شخص کے لیے اپنی شکست کا اعتراف کرنا آسان نہیں، نہ اس کے لیے اپنی اس رائے سے دستبردار ہونا سہل ہے جس کا وہ اب تک دفاع کرتا آیا ہے۔ اس لیے داعی پر واجب ہے کہ وہ مخاطب کو احساس دلائے کہ اس کی ذات میں کوئی عیب نہیں اور وہ بے حد محترم ہے۔ چنانچہ نہ اس پر غضبناک ہو اور نہ خود کو اس سے برتر سمجھے اور نہ ہی اس کو برا بھلا کہے اور نہ ذلیل کرے اور نہ ہی جاہل کہے۔ کیونکہ مباحثہ کا مقصد مخاطب کو حامی بنانا ہے نہ کہ اس کی دشمنی مول لینا۔ داعی پر یہ بھی واجب ہے کہ وہ مباحثہ کے لیے بہترین اسلوب اختیار کرنے کی تمنا وخواہش رکھے۔ مثلاً مخاطب کو اپنے اور داعی کے مابین کوئی خلیج نہ محسوس ہو۔ نہ یہ محسوس ہو کہ وہ کوئی غیر یا اجنبی ہے یعنی اسے اجنبیت بھی محسوس نہ ہو۔ اسی طرح داعی پر واجب ہے کہ وہ مخاطب کی ذاتی ضروریات کا بھی لحاظ رکھے مثلاً گفتگو کے لیے مناسب وقت کا انتخاب کرے اور مناسب الفاظ استعمال کرے۔ جس طرح مقولہ ہے کہ ''موقع محل دیکھ کر بات کرنی چاہیے'' کیونکہ اگر داعی مخاطب کے دل میں جگہ بنا لے گا تو وہ اپنے ذہن کو بھی داعی کی باتوں کے لیے کھول دے گا۔ پس عقل کو جھنجھوڑنے کا راستہ دل سے ہو کر گزرتا ہے۔ اسی لیے عقل کو مخاطب کرنے سے پیشتر دل کا جیتنا ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب قبیلہ بنی عبداللہ کے پاس دعوت کی غرض سے تشریف لے گئے تو آپ نے اپنی گفتگو کا آغاز ان الفاظ سے کیا: ﴿ان اللّٰه قد أحسن اسم ابيكم﴾ ''بے شک اللہ نے تمہارے باپ کا بہترین نام رکھا'' کیونکہ ان کے باپ کا نام عبدالات یا عبدالعزیٰ نہیں تھا بلکہ عبداللہ تھا۔ ایسا آپ نے ان کے دل جیتنے کے لیے کہا تا کہ وہ آپ کی بات سننے کے لیے تیار ہو جائیں اور آپ سے بصد شوق گفتگو کریں۔

داعی پر ہر طرح کے حالات میں حق بات کہنا فرض ہے اور یہ کہ وہ تکالیف پر صبر کرے۔ مؤمن کو باعمل کا صبر کرنا چاہیے نہ کہ بے عمل اور مصلحت پسندوں کا صبر۔ صحیح بخاری میں عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ((بايعنا رسول الله ﷺ على السمع والطاعة في المنشط والمكره ، وأن لا ننازع الأمر أهله ، وأن نقوم أو نقول بالحق حيثما كنا، لانخاف في الله لومة لائم)) ''ہم نے پسند اور ناپسند (دونوں حالتوں میں) سننے اور اطاعت کرنے پر رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی۔ اور اس بات پر کہ ہم اہلِ امر کے ساتھ نزاع نہیں کریں گے۔ اور ہم حق کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے، یا حق بات کہہ دیں گے، خواہ جس بھی حالت میں ہوں۔ اور اللہ کے معاملے میں کسی بھی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈریں گے''

(بخاری)

❁❁❁

﴿وَ مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَآ نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾

''اور جو کچھ رسول ﷺ تمہیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز رہو'' (الحشر: 7)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **((من أصيب بمصيبة بماله أو في نفسه فكتمها ولم يشكها إلى الناس ، كان حقاً على الله أن يغفر له))** ''جس شخص کو اس کے مال کے ذریعے یا اس کی جان پر مصیبت آئے اور وہ اسے چھپائے اور لوگوں کے سامنے اس کی شکایت نہ کرے تو اس کا اللہ پر حق ہے کہ اللہ اس کی مغفرت فرمادے۔ (طبرانی)

مندرجہ بالا حدیث صبر اور اس کے عظیم اجر کے متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مصیبت کی حالت میں صبر اختیار کرنے کے معاملے میں مسلمانوں کے لیے بہت ہی زیادہ نفع رکھا ہے۔ ایک اور حدیث میں صہیبؓ نے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **((عجباً لأمر المؤمن إن أمره كله له خير، إن أصابته سراء شكر فكان خيراً له، وإن أصابته ضراء صبر فكان خيراً له، وليس ذلك لأحد إلا للمؤمن))** ''مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کے ہر معاملے میں خیر ہی خیر ہے۔ اگر اسے کوئی خوشی پہنچے تو وہ شکر ادا کرتا ہے پس یہ اس کے لیے خیر ہے اور جب اس پر مصیبت آتی ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کے لیے خیر ہے اور یہ صرف مومن ہی کے لیے ہے'' (مسلم)

یہاں پر اس غلط فہمی کو دور کرنا بہت ضروری ہے جو کچھ مسلمان صبر کی حقیقت اور مفہوم کے متعلق رکھتے ہیں۔ بعض مسلمان یہ گمان کرتے ہیں کہ صبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک خول میں بند کرلیں، لوگوں سے کنارہ کش ہوجائیں، منکرات کو ہونے دیں اور منکرات کرنے والوں کا ہاتھ کھلا چھوڑ دیں، حرمتوں کے تقدس کی پامالی، حدود کی معطّلی اور جہاد کے خاتمے کو خاموشی سے دیکھتے رہیں۔ وہ ان باتوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑے نہیں ہوتے۔ وہ اس سے دور رہتے ہیں اور نہی عن المنکر کے فرض سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں۔

جبکہ کچھ لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ صبر کے معنی ہیں کہ اپنے آپ کو مشکلات سے دور رکھا جائے اور اگر اللہ کے دشمنوں سے سامنا ہوجائے تو ان سے تعرض کرکے اپنے آپ کو مصیبت سے بچایا جائے۔ وہ حق بات کہنے کی جرأت نہیں کرتے اور نہ ہی ایسا عمل کرتے ہیں جو اللہ کو پسند ہے۔ بلکہ وہ خاموش رہتے ہیں اور کسی کونے میں پڑے رہتے ہیں اور اپنے آپ سے کہتے ہیں کہ میں صبر کررہا ہوں۔ یہ وہ صبر نہیں جس کے بدلے میں اللہ نے جنت کے باغوں کا وعدہ کیا ہے۔ بلکہ یہ بعینہٖ وہی کمزوری ہے جس سے رسول اللہ ﷺ اپنی دعا میں پناہ مانگا کرتے تھے۔ آپ اللہ سے دعا مانگا کرتے تھے: ''میں کمزوری سے، سستی سے، بزدلی سے، بخل سے، غمی سے، قرضے کے بوجھ سے اور لوگوں کے ظلم سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

صبر کا مطلب ہے کہ حق بات کہی جائے اور حق پر عمل کیا جائے، اللہ کی راہ میں ایذا رسانی کو برداشت کیا جائے اور اس راہ سے نہ تو انحراف کیا جائے، اور نہ کمزوری دکھائی جائے اور نہ ہی نرم ہوا جائے۔ بے شک صبر وہ ہے کہ جس کی بنیاد اللہ کے خوف پر ہو، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لاَ يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ ''بے شک جو اللہ سے ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے۔ یقیناً اللہ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتا'' (یوسف: 90) اللہ تعالیٰ نے صبر کو ان لوگوں کی نسبت سے بیان کیا ہے جو اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ ارشاد ہوا: ﴿وَكَأَيِّنْ مِّنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ﴾ ''اور بہت سے نبی ہو گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر اکثر اللہ والوں نے قتال کیا۔ تو جو مصیبتیں انہیں اللہ کی راہ میں آئیں، ان کے سبب انہوں نے نہ تو ہمت ہاری اور نہ ہی بزدلی دکھائی اور نہ ہی وہ (کافروں کے سامنے) جھکے اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے'' (آل عمران: 146)

یہ وہ صبر ہے جو ہمت کو مزید بڑھاتا ہے اور جنت کے راستے کو قریب کرتا ہے۔ یہ بلالؓ، خبابؓ اور آل یاسرؓ کا صبر ہے، جنھوں نے کفار کی اذیتیں برداشت کیں اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں جنت کی بشارت دی۔ یہ اللہ کے صادق اور امین رسول ﷺ کے ممتاز صحابہؓ کا صبر ہے۔ یہ اصحابِ صحیفہ کا، شعب کے مقطعین کا، حبشہ کے مہاجرین کا اور ان لوگوں کا صبر ہے جن کا محض اس وجہ سے تعاقب کیا گیا کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ یہ اس شخص کا صبر ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے اور اللہ کی راہ میں سختی کی وجہ سے اس پر ضعف طاری نہیں ہوتا۔ یہ اس شخص کا صبر ہے جو اس بات کی توثیق کرتا ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ. الَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْن. أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾

''اور ہم کسی قدر خوف، بھوک، مال، جانوں اور پھلوں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو بشارت سنادو۔ ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی مہربانی اور رحمت ہے اور یہی سیدھے رستے پر ہیں۔''

(البقرۃ: 155-157)

مشرف کو کشمیر پر غداری سے روکنا ہوگا

سلیم سیٹھی
saleem.sethi@yahoo.com

7 دسمبر کو کوئٹہ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے جنرل مشرف نے کہا: ''میں جو وعدہ کرتا ہوں وہ پورا کرتا ہوں'' بالکل صحیح کہا کیونکہ جنرل مشرف نے اپنے اقتدار کے بدلے امریکہ سے جو وعدے کیے ہیں انہیں وہ ایک ایک کر کے پورا کر رہا ہے۔ 15 نومبر کو 'حقوقِ نسواں بل' کے نام سے اسلام پر حملے کا بل منظور ہوا۔ ابھی امت کے یہ زخم تازہ تھے کہ 5 دسمبر کو مشرف نے ایک اور دھماکہ کر دیا، جب بھارت کے ٹیلی ویژن 'این ڈی ٹی وی' سے کیا گیا مشرف کا انٹرویو منظر عام پر آیا۔ اس کے اندر مشرف نے آزاد اور مقبوضہ کشمیر کے متعلق اپنی شرائط بیان کی ہیں، جو اس قدر ذلت آمیز ہیں کہ گویا مسلمان بھارت سے جنگ ہارنے کے بعد ہندوؤں کے سامنے جھک کر شرائط طے کر رہے ہوں۔

انٹرویو کے اندر ہندو میزبان ڈاکٹر 'پرانے رائے' نے جب جنرل مشرف سے پوچھا کہ: ''بالآخر اس حل میں (جو آپ نے بیان کیا) پاکستان کشمیر پر اپنے حق سے دستبردار ہو رہا ہے؟'' تو اس کے جواب میں جنرل مشرف نے کہا: ''ہم دونوں (ممالک) کو چاہیے کہ ہم اس تمام سے دستبرداری کے لیے تیار رہیں، جو ماضی میں ہم کہتے رہے ہیں۔''

اس کے بعد مشرف نے آزاد اور مقبوضہ جموں وکشمیر کو ہندو ریاست کی جھولی میں ڈالنے کے منصوبے کا خاکہ بیان کیا۔ آزاد کشمیر، جسے مسلمانوں نے سخت جدوجہد کے بعد آزاد کرایا، کے متعلق مشرف نے ہندوؤں کو یقین دہانی کرائی کہ اب وہ آزاد کشمیر پر مشترکہ کنٹرول قائم کر سکیں گے۔ اور جہاں تک مقبوضہ کشمیر کا تعلق ہے تو مشرف نے ہندو تسلط سے مقبوضہ کشمیر کی آزادی کو یکسر مسترد کر دیا اور یوں وہ مقبوضہ کشمیر، جہاں مسلمان چھ دہائیوں تک ہندو مشرکین کی سفاک مسلح افواج کے خلاف بہادری سے جہاد کرتے رہے ہیں، کے متعلق مشرف نے ہندوؤں کو یقین دہانی کرائی کہ وہ مقبوضہ کشمیر پر اپنے کنٹرول کو بدستور قائم رکھ سکیں گے۔ جب میزبان نے سوال کیا: ''پھر کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ کشمیر کے لیے کوئی آزادی نہیں؟'' تو مشرف نے اس بات کی توثیق ان الفاظ میں کی: ''ہاں ہم آزادی کے خلاف ہیں۔'' میزبان نے اپنے سوال کو ایک مرتبہ پھر دہرایا اور پوچھا: ''تو آپ کشمیر پر اپنے حق سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہیں؟'' مشرف نے پھر اُس کی بات کی توثیق کرتے ہوئے کہا: ''ہمیں ایسا کرنا ہی پڑے گا، بالکل، اگر یہ (تجویز کردہ) حل طے ہو جائے''

مزید برآں دفتر خارجہ کی خاتون ترجمان تسنیم اسلم نے 11 دسمبر 2006 کو صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے حکومت پاکستان کے مؤقف کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان نے کبھی بھی کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ نہیں کہا اور کشمیر بنے گا پاکستان کا نعرہ ہمارا نہیں، صرف کشمیریوں کا ہے''

یعنی ان کا مطلب ہے کہ اٹوٹ انگ کا دعویٰ تو بھارت کا ہے اور اِسی دعوے کو حکومتِ پاکستان تسلیم کرتی ہیں۔

جنرل مشرف یوں تو زندگی کے ہر معاملے میں پاکستان کے مسلمانوں کو مغرب کا غلام بنانے میں مصروف ہے لیکن چونکہ کشمیر ایک ایسا پوائنٹ ہے جو تو ایک طرف پاک بھارت تعلقات بگڑنے اور سنورنے کا باعث بنتا ہے اور دوسرا سٹریٹیجک مقام ہونے کی بنا پر نہ صرف بھارت کی اہم ضرورت ہے بلکہ استعماری ممالک کی نظریں بھی اس مقام پر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے معاملے میں امریکہ نے پاکستان سے کئی وعدے لیے، اور یہ سلسلہ نیا نہیں بلکہ کئی سالوں سے چل رہا ہے۔ 5 جون 2002ء کو جب واجپائی نے اعلان کیا: ''پاکستان کا دعویٰ ہے کہ دراندازی رک گئی ہے..... مگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ سرحد پار دہشت گردی کے کیمپ بھی بند کیے جائیں۔'' تو امریکہ نے فوراً مزید مطالبات پر بھارت کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اسی دن وائٹ ہاؤس کے ترجمان ایری فلیشر نے اعلان کیا: ''صدر (بش) نے صدر مشرف سے اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ امریکہ یہ توقع کرتا ہے کہ پاکستان دہشت گردی کی تمام تر حمایت کو مکمل طور پر ختم کرنے کے وعدوں کو پورا کرے گا'' اور امریکہ اپنے ساتھ کئے گئے وعدوں پر نظر بھی رکھتا ہے چنانچہ 18 جون 2002 کو امریکی پالیسی ساز اور ہندو پارلیمنٹ کے ممبران، کشمیر کا جائزہ لینے کے لیے جمع ہوئے۔ امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے پالیسی پلاننگ کے ڈائریکٹر رچرڈ ہاس نے اعلان کیا کہ صدر مشرف امریکہ اور بھارت کے اہداف پورے کر رہے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ تھے ''انہوں (مشرف) نے لائن آف کنٹرول کے آر پار دہشت گردی اور دہشت گردی کے کیمپوں کے خاتمے کا عزم کیا ہے ہم (اس سمت میں) خاطر خواہ پیش قدمی دیکھ رہے ہیں..... یہ بھارت اور امریکہ کے عین مفاد میں ہے کہ مشرف کو کامیابی حاصل ہو.....''

مشرف بڑی تندہی کے ساتھ امریکی ہندو منصوبے کی تکمیل میں پورا تعاون کر رہا ہے۔ اور وہ کشمیر سے دست بردار ہونے کو ایک شاندار حکمتِ عملی کے طور پر پیش کرتا ہے۔ درحقیقت مشرف نے پاکستان کو ہونے والے تمام عظیم نقصانات کو ایسی شاندار حکمتِ عملی کی طرح پیش کیا گویا یہ مزید نقصانات سے بچنے کے لیے ضروری ہیں۔ افغانستان سے دست بردار ہوتے وقت مشرف نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ایسا کرنا کشمیر سمیت دوسرے پاکستانی مفادات کی حفاظت کے لیے ناگزیر ہے۔ اب مشرف کشمیر سے دست بردار ہو رہا ہے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ یہ نقصان اٹھانا بھی ضروری ہے۔

مشرف کا طرزِ عمل ایسا ہے کہ وہ امریکہ کے مفادات کی خاطر کشمیر کو بھارت کی جھولی میں ڈالنا

چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ بھارت کو ہر ممکن رعائتیں دے رہا ہے۔ مشرف بھارت کے ساتھ وہی طرزِ عمل اختیار کر رہا ہے جو اُس نے امریکہ کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے: اس امید پر سمجھوتے پر سمجھوتہ کرتے جانا کہ شائد دوسرا فریق اس کے لیے کچھ نرمی کا مظاہرہ کرے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی بھی اس شخص سے فراخ دلی سے پیش نہیں آئیں گے جو اُن کے سامنے اس قدر کمزوری دکھائے گا۔

یہ مشرک ہندو کیسے مسلمانوں سے مخلص ہو سکتے ہیں جبکہ ہم ماضی میں دیکھ سکتے ہیں کہ جب بھی ان کو مسلمانوں پر اتھارٹی ملی، انہوں نے مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔ تقسیمِ برصغیر سے پہلے بھی انگریزوں کے مسلمانوں پر ظلم میں ہندوؤں نے ان کا پورا ساتھ دیا، پھر تقسیم کے وقت ہجرت کے دوران 1947 میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کے قتلِ عام کو کوئی نہیں بھول سکتا۔ اور تو اور واجپائی حکومت نے 2002 میں گجرات کے اندر مسلمانوں کا جو قتلِ عام کیا تھا وہ بہت ہی ہولناک تھا۔ 28 فروری 2002ء سے ہندو بلوائیوں نے پورے گجرات میں کم از کم دو ہزار مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ یہ قتلِ عام ایک منظّم طریقے سے کیا گیا۔ آتش زنی، آبرو ریزی، قتلِ عام ایک مخصوص طریقہ کار اور تربیت کے مطابق تھا۔ ہر گروہ میں کئی ہزار ہندو شامل تھے اور انہوں نے بیک وقت گجرات کے کئی علاقوں پر حملہ کیا۔ جلی ہوئی لاشیں اور زندہ بچ جانے والے شدید زخمی اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہندوؤں نے ایک منظّم طریقے سے مسلمانوں کو زندہ جلایا اور زندہ حالت میں ان کے جسم کے ٹکڑے کئے گئے۔ بے شمار عینی گواہوں کی رپورٹوں کے مطابق مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کی اجتماعی آبرو ریزی کے بعد شواہد کو مٹانے کے لئے انہیں زندہ جلا دیا گیا یا ان کے جسم کے ٹکڑے کئے گئے۔ یہاں تک کہ مسلمان حاملہ عورت کے پیٹ کو چاک کر کے اس کے بچے کو اس کے سامنے قتل کیا گیا تا کہ وہ اپنی موت سے پہلے اپنے بچے کی موت کا تکلیف دہ منظر دیکھے۔

پس یہ ہیں ہندو ریاست کے کرتوت جو کہ اس کے ماضی اور حال کی عمومی خصلت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ یہ ہندو ریاست ہی ہے جو کہ پچھلے پچاس سال سے زائد عرصہ سے مسلمان باشندوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہی ہے۔ یہ ہندو ریاست ہی ہے جس نے کشمیر میں مسلمانوں کا بے دریغ خون بہایا۔ یہ ہندو ریاست ہی ہے جو غیر مسلم اقلیتوں یعنی سکھ اور عیسائیوں پر ظلم وستم ڈھا رہی ہے۔ اور یہ ہندو ریاست ہی ہے جو کہ اپنے ہی ہم مذہب ہندوؤں پر درپردہ جبر کرنے کی اجازت دیتی ہے، جنہیں بے رحمی سے اچھوت کہا جاتا ہے۔ اپنی سرحدوں کے اندر ظلم کر لینے کے بعد بھی جب ہندو ریاست کی پیاس نہیں بجھتی تو وہ اسرائیل جیسے مسلم دشمن ممالک کو اپنا حلیف بناتی ہے۔ اللہ نے مشرکین کے دل میں مومنین کے خلاف شدید نفرت کی تصدیق کی ہے:

﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا﴾

''یقیناً آپ ایمان والوں کا سب سے زیادہ دشمن یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے'' (المائدۃ:82)

مشرف اپنی تجاویز کی صورت میں ایک بھیانک غداری کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ اور اس کی طرف سے کشمیر کے مسلمانوں کو قربانی کی بھینٹ چڑھانے کے نتیجے میں ہندو ریاست کو اس بات کی فرصت مل جائے گی کہ وہ امت مسلمہ کے خلاف اپنے منصوبوں میں پیش رفت کر سکے۔ کشمیر کی جدوجہد بھارت کے وسائل بالخصوص بھارت کی فوج پر بھاری بوجھ رہی ہے۔ اور اس کا احساس بھارت کو بڑی شدت سے ہے جیسا کہ 19 جولائی 1999 کو بھارتی چیف آف آرمی سٹاف وی پی ملک نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ لائن آف کنٹرول اس قدر طویل اور ناہموار ہے کہ کسی بھی فوج کے لیے اس کی مکمل حفاظت کرنا ممکن نہیں۔ اسی طرح بی بی سی ڈاٹ کام نے اپنی ایک رپورٹ میں بیان کیا کہ 2006 میں 76 بھارتی فوجی مجاہدین کے ہاتھوں جہنم رسید ہوئے جبکہ 102 فوجیوں نے خودکشی کر لی تھی۔ اب مشرف اُسی کشمیر کو آسانی سے ہڑپ کرنے کے لیے مذاکرات کی میز پر اسے بھارت کے سامنے پلیٹ پر رکھ کر پیش کر رہا ہے۔ کشمیری جدوجہد کو کچلنے کے بعد اگلا قدم یہ ہوگا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان تعلقات کی نارملائزیشن کو جاری رکھا جائے گا، جس کا اصل مقصد یہ کہ کہ ہندوؤں کو امت مسلمہ کی دولت، وسائل اور منڈیوں میں حصہ عطا کر کے اسے مسلمانوں کے خلاف مضبوط بنایا جائے۔ پھر پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو ختم کیا جائے گا اور پھر اکھنڈ بھارت کی طرف قدم بڑھایا جائے گا۔

ہمارے حکمران کفار کے سامنے بچھے چلے جا رہے ہیں۔ کشمیر کا سودا 80 ہزار سے زائد شہدا کے خون کے ساتھ غداری ہوگی اور بھارت کو مسلمانوں پر اپنے ظلم جاری رکھنے کا اختیار مل جائیگا۔ اس بھیانک غداری کے خلاف پاکستان کے مسلمانوں کو آواز اٹھانا ہوگی۔ اسی طرح پاکستان کی مسلح افواج مسلمانوں کی ایک عظیم قوت ہے۔ اور اس کے پاس وہ قوت موجود ہے کہ وہ نا صرف مشرف کی اس غداری کو ہاتھ سے روک سکتے ہیں، بلکہ وہ بزورِ شمشیر کشمیر کو ہندوؤں سے آزاد کرا کے پاکستان کا حصہ بنا سکتے ہیں۔

ہمیں مشرف کی اس غداری کو روکنا ہوگا، ورنہ اگر آج ہم خاموش رہے اور کشمیری مسلمانوں کو ہندوؤں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا اور ظالم حکمران کا ہاتھ نہ روکا تو موجودہ اور آنے والی نسلیں اس غداری کا خمیازہ بھگتیں گی۔ اور قیامت کے دن اللہ کے حضور ہمارے پاس کوئی حجت نہ ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا اور خبردار فرمایا:

((والذي نفسي بيده لتأمرن بالمعروف و لتنهون عن المنكر ، أوليوشكن الله أن يبعث عليكم عقاباً من عنده ، ثم لتدعنه فلا يستجاب لكم))

''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم ضرور تمام تر نیکی کا حکم دو اور تمام تر برائی سے منع کرو، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تم پر اپنا عذاب نازل کرے۔ اور پھر تم اللہ سے دعا مانگو تو وہ اسے قبول نہ کرے''

(احمد نے حذیفہ ؓ سے اس حدیث کو روایت کیا)

❁❁❁

خلافت کا قیام - مسلمانوں پر فرض ہے اور اس سے غفلت برتنا حرام ہے

نوید بٹ

navid.butt@yahoo.com

اسلام ایک مسلمان کو انفرادی فرائض مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ اجتماعی فرائض کی پابندی کا بھی حکم دیتا ہے۔ جس طرح اسلام ہمیں روزے فرض کرنے کے لئے ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (روزے تم پر فرض کر دیئے گئے ہیں) کا حکم دیتا ہے بالکل اسی پیرائے میں ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ﴾ (قصاص لینا تم پر فرض کر دیا گیا ہے) کا حکم بھی دیتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلا حکم انفرادی نوعیت کا ہے جبکہ دوسرا حکم اجتماعی نوعیت کا۔ ایک مسلمان انفرادی طور پر روزے تو رکھ سکتا ہے لیکن انفرادی طور پر اللہ کی حدوود یا جنایات مثلاً قصاص نافذ نہیں کر سکتا۔ الحمد للہ عام طور پر انفرادی فرائض کی پاس داری کے لئے مسلمان ایک دوسرے کو یاددہانی کراتے رہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اجتماعی فرائض کا تعلق ہے تو اس کو پورا کرنے کے لئے کماحقہٗ آواز سننے کو نہیں ملتی۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے اجتماعی فرائض کو پورا کرنے کا ایک واضح طریقہ کار بتایا ہے۔ مثال کے طور پر قصاص کے اجتماعی حکم کو نافذ کرنے کے لئے اسلام ایک شرعی قاضی کی موجودگی کا حکم دیتا ہے اور یہ اختیار فقط قاضی کو تفویض کرتا ہے کہ وہ ثبوت کی موجودگی میں سزا کا حکم صادر کرے۔ نیز اسلامی ریاست یعنی خلافت اس سزا کو نافذ کرنے کے لئے قاضی کو پولیس اور عملہ مہیا کرتی ہے جو فی الفور اس سزا کو نافذ کرتا ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ اسلام بیشتر اجتماعی فرائض سے عہدہ براء ہونے کے لئے اسلامی ریاست یعنی خلافت کی موجودگی کو پیشگی شرط (pre condition) بناتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں پر یہ بھی اجتماعی طور پر فرض ہے کہ ان کے معاشرے میں مظلوم کو انصاف ملے اور ظالم کا ہاتھ روکا جائے، مسلمانوں کے تمام مقبوضہ علاقوں کو کافروں کی تسلط سے آزاد کرایا جائے، کشمیر، عراق، چیچنیا، فلسطین میں رہنے والے مسلمانوں پر ظلم کو روکا جائے، حکمران اسلام کے تحت حکومت کریں، اسلام کے درست فہم کو پورے معاشرے تک پہنچایا جائے، اسلامی دعوت کو پوری دنیا تک پھیلانے اور اللہ کے نام کو سربلند کرنے کے لئے منظم جہاد کیا جائے وغیرہ۔ یہ امر واضح ہے کہ یہ تمام اجتماعی فرائض ہر شخص فرداً فرداً پورا نہیں کر سکتا اسی لئے اسلام نے ہمیں ان فرائض کو پورا کرنے کا طریقہ کار بتایا ہے۔ اس طریقہ کار کے مطابق مسلمان ان اجتماعی فرائض کی ذمہ داری، جو کہ درحقیقت ''فرض کفایہ'' ہیں، ایک شخص کی گردن پر ڈال دیتے ہیں اور اس کی بیعت کرتے ہیں جو کہ اس شرط پر ہوتی ہے کہ وہ ان پر اسلام نافذ کرتے ہوئے ان تمام اجتماعی فرائض سے عہدہ براء ہوگا۔ تمام مسلمان ان فرائض کی انجام دہی میں اس کے حکم کی اتباع اور اس کی مدد کریں گے۔ چنانچہ یہ خلیفہ ہی ہوتا ہے کہ جو مسلمانوں سے خراج، عشر، زکوٰۃ وغیرہ اکھٹی کر کے انہیں مستحقین میں تقسیم کرتا ہے تاکہ کوئی بھوکا نہ رہے۔ یہ خلیفہ ہی ہوتا ہے جو ان مسلمانوں کو منظم کر کے ایک طاقتور فوج تشکیل دیتا ہے جس کے ذریعے جہاد کیا جاتا ہے اور اسلام کی دعوت کو پوری دنیا تک پھیلایا جاتا ہے۔ یہ خلیفہ ہی ہوتا ہے جو قاضی کو متعین کرتا ہے جو اسلام کے احکامات اور حدود نافذ کر کے مظلوم کو انصاف فراہم کرتا اور ظالم کا ہاتھ روکتا ہے۔

چنانچہ معلوم ہوا کہ بیشتر اجتماعی فرائض سے عہدہ براء ہونے کے لئے اسلام شرعی اسلامی ریاست یعنی خلافت کی موجودگی کو شرط بناتا ہے۔ لہٰذا آج اسلام کے بیشتر اجتماعی فرائض خلافت اور شرعی اتھارٹی کے بغیر پورے ہی نہیں ہو سکتے۔ اسلام کی رو سے ہر وہ عمل جس پر کسی فرض کا دارومدار ہو اور جس کے نہ کرنے کی بنا پر ایک فرض ادا نہ ہو سکتا ہو تو اس عمل کا کرنا بھی فرض ہو جاتا ہے۔ شرعی اصول ہے (مالا یتم الواجب الا بہ فھو واجب) ''جس عمل کے کئے بغیر واجب ادا نہ ہو سکے تو پھر اس کا کرنا بھی واجب ہے'' اب چونکہ خلافت کی عدم موجودگی میں تقریباً تمام اجتماعی احکامات پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا اسی لئے فقہاء اقامت خلافت کو ''اُمّ الفرائض'' قرار دیتے ہیں۔ یہی وہ اہم فرض ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول ﷺ نے فرمایا تھا: ((تنقض عری الاسلام عروۃ عروۃ اولھا الحکم و اخرھا الصلاۃ)) ''اسلام کی گرہیں ایک ایک کر کے کھل جائیں گی، سب سے پہلے جو گرہ کھلے گی وہ (اسلام کے مطابق) حکمرانی کی ہوگی اور سب سے آخر میں نماز کی گرہ کھلے گی'' نیز اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرماتے ہیں: ﴿هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ (التوبۃ: 33) ''وہی وہ ذات ہے جس نے بھیجا اپنا رسول ہدایت اور دین حق کیساتھ تاکہ غالب کر دے اسے تمام ادیان پر خواہ (یہ بات) مشرکوں کو کتنی ہی ناگوار ہو''

یہ امر بدیہی ہے کہ قرآن کے مندرجہ بالا حکم پر چلنے کے لئے یعنی اسلام کو تمام ادیان پر غالب کرنے کے لئے، ایک طاقتور ریاست کی ضرورت ہے جو یقیناً خلافت کے علاوہ کچھ نہیں۔ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب ''السیاسۃ الشرعیہ'' (صفحہ 189) پر اس کی یوں وضاحت فرمائی: ''ریاست (خلافت) کی زبردست طاقت کے بغیر دین خطرے میں ہوتا ہے اور الہامی قوانین (شریعت) کے نفاذ کے بغیر ریاست جابرانہ ادارہ بن جاتی ہے۔''

خلافت کی فرضیت کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی احادیث مبارکہ کے ذریعے بڑے واضح انداز میں بیان فرمایا۔ امام مسلم نے ابن عمرؓ سے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَن خَلَعَ يَدًا مِّنْ طَاعَةٍ، لَقِيَ اللّٰهَ يَومَ القِيَامَةِ، لَاحُجَّةَ لَهٗ، وَمَن مَاتَ وَلَيسَ فِي عُنُقِهٖ بَيعَةٌ، مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً)) ''جو شخص (امیر کی) اطاعت سے اپنا ہاتھ کھینچ لے تو قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی اور جو کوئی اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں بیعت (کا طوق) نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

اس حدیث میں دور جاہلیت میں مرنے سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ وہ شخص نعوذ باللہ کافر مرے گا بلکہ یہ اس بات کو نہایت ہی بھرپور انداز میں بیان کرنے کا طریقہ ہے کہ کوئی بھی مسلمان ایسی حالت میں زندگی

بسر نہ کرے کہ اس کی گردن میں خلیفۂ وقت کی بیعت موجود نہ ہو۔ یعنی یہ حدیث اس امر کو بڑی سختی سے بیان کر رہی ہے کہ کوئی ایسا دور نہ گزرے جب مسلمان خلافت کے بغیر ہوں۔ لہٰذا اس حدیث کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر یہ فرض قرار دیا ہے کہ ہر مسلمان کی گردن میں خلیفہ کی بیعت کا طوق ہو، یہ نہیں فرض کیا کہ ہر مسلمان خلیفہ کی بنفس نفیس بیعت کرے۔ خلیفہ کے موجود ہونے سے ہر مسلمان کی گردن میں بیعت کا طوق ہوتا ہے چاہے وہ بالفعل بیعت نہ بھی کرے۔ چنانچہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خلیفہ کا تقرر اور خلافت کا ہونا فرض ہے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے خلیفہ کے لئے شرعی اتھارٹی یعنی سلطان کا لفظ استعمال کرتے ہوئے اس کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے۔ صحیح مسلم میں ابن عباسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَن كَرِهَ مِنْ اَمِيرِهِ شَيئًا فَلْيَصْبِرْ عَلَيهِ ، فَاِنَّهُ لَيسَ اَحَدٌ مِّنَ النَّاسِ يَخْرُجُ مِنَ السُّلْطَانِ شِبرًا ، فَمَاتَ عَلَيهِ ، اِلَّا مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً)) "جس نے اپنے امیر کی کسی چیز کو ناپسند کیا تو لازم ہے کہ وہ اس پر صبر کرے۔ کیونکہ لوگوں میں سے جس نے بھی سلطان (یعنی شرعی اتھارٹی) کی اطاعت سے بالشت برابر بھی خروج کیا اور وہ اس حالت میں مرگیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا"

اس حدیث میں نہ صرف سلطان (شرعی اختیار کے حامل شخص) سے علیحدگی اختیار کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے بلکہ یہ حدیث اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ مسلمانوں پر اپنے لیے ایک ایسے سلطان کو مقرر کرنا واجب ہے جس کی اطاعت کی جائے اور جو ان پر اسلام نافذ کرے۔

اس سے ملتی جلتی حدیث میں آپ ﷺ نے جماعت سے بغاوت کرنے کی حرمت بیان فرمائی ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہاں جماعت سے مراد کوئی سیاسی پارٹی یا گروہ نہیں بلکہ "جماعت المسلمین" ہے یعنی خلیفہ تلے متحد امت مسلمہ۔ درحقیقت مسلمانوں کو اسلام کے جھنڈے تلے جمع کرنے والا محض خلیفہ ہی ہوتا ہے۔ جب خلیفہ موجود ہوگا تو مسلمانوں کی جماعت بھی ہوگی اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ مل کر رہنا فرض اور ان کے خلاف بغاوت حرام ہوگی۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ رَاٰى مِنْ اَمِيرِهِ شَيئًا يَكْرَهُهُ فَلْيَصْبِرْ عَلَيهِ ، فَاِنَّهُ مَن فَارَقَ الجَمَاعَةَ شِبرًا فَمَاتَ اِلَّا مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً)) "جو شخص اپنے امیر کے کسی ناپسندیدہ کام کو دیکھے تو اس پر صبر کرے۔ کیونکہ جس نے بھی جماعت سے بالشت بھر علیحدگی اختیار کی اور اس حالت میں مرگیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا"

واضح رہے کہ یہ دونوں احادیث اُس وقت خلیفہ کی اطاعت کو فرض قرار دیتی ہیں جب وہ اسلامی نظام نافذ کر رہا ہو لیکن انفرادی طور پر کچھ خامیوں اور برائیوں کا شکار ہو یا کچھ لوگوں پر ظلم کر رہا ہو اور کچھ کو نواز رہا ہو۔ لیکن اگر وہ اسلام کے بجائے کسی بھی کفر کے ذریعے حکومت کرے تو اس کی اطاعت لازم نہیں رہتی جس کا حکم رسول اللہ ﷺ کی دیگر صحیح احادیث میں ملتا ہے۔

مزید برآں رسول اللہ ﷺ نے خلفاء کی اطاعت اور ان کی خلافت میں تنازع کرنے والوں سے قتال کا حکم دیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ خلافت کو قائم کرنا اور اس کی حفاظت کرنا اور اس میں تنازع کرنے والوں کے خلاف جنگ کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ مسلمؒ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَمَنْ بَايَعَ اِمَامًا فَاَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهِ وَثَمَرَةَ قَلْبِهِ ، فَلْيُطِعْهُ اِنِ استَطَاعَ ، فَاِنْ جَآءَ آخَرُ يُنَازِعُهُ فَاضرِبُوا عُنُقَ الآخَرِ)) "اور جو شخص کسی امام (خلیفہ) کی بیعت کرے تو اسے اپنے ہاتھ کا معاملہ اور دل کا پھل دے دے (یعنی سب کچھ اس کے حوالہ کردے) پھر اسے چاہیے کہ وہ حسبِ استطاعت اس کی اطاعت بھی کرے۔ اگر کوئی دوسرا شخص آئے اور پہلے خلیفہ سے تنازع کرے تو دوسرے کی گردن اڑا دو"

امام کی اطاعت کا حکم اس کی اقامت کا حکم بھی ہے اور اس کے ساتھ جھگڑنے اور اس کی اتھارٹی کو چیلنج کرنے والے کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم خلیفہ کے ایک ہونے پر حتمی حکم (طلبِ جازم) کے لیے واضح قرینہ ہے۔ ایک دوسری حدیث میں تو آپ ﷺ نے اس کو نہایت ہی سادے اور کھلے انداز میں یوں بیان فرمایا: ((اِذَا بُويِعَ لِخَلِيفَتَينِ ، فَاقْتُلُوا الآخَرَ مِنْهُمَا)) (صحیح مسلم) "اگر دو خلفاء کے لیے بیعت کی جائے تو ان میں سے بعد والے کو قتل کردو۔" ایک اور جگہ فرمایا: ((مَنْ أَتَاكُمْ ، وَأَمْرُكُمْ جَمِيعٌ ، عَلٰى رَجُلٍ وَّاحِدٍ ، يُرِيدُ أنْ يَّشُقَّ عَصَاكُمْ ، أوْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ ، فَاقْتُلُوْهُ)) (صحیح مسلم) "تم کسی ایک شخص پر (امارت کے لئے) متفق ہو اور کوئی شخص آئے اور تمہاری صفوں میں رخنہ ڈالنا چاہے یا تمہاری جماعت میں تفرقہ ڈالے تو اسے قتل کردو"

اس حدیث سے واضح ہوگیا کہ اسلامی ریاست تمام مسلمانوں کے لئے ایک ہی ہوتی ہے اور مسلمانوں میں ایک سے زائد خلیفہ اور ایک سے زائد ریاستوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ چنانچہ مغرب سے حاصل شدہ "قومی ریاستوں" (Nation States) کے تصور کو اسلام سختی سے رد کرتا ہے۔ اس ضمن میں امام شافعیؒ (202ھ) "الرسالة" میں صفحہ 260 میں لکھتے ہیں: "مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ خلیفہ ایک شخص ہی ہوسکتا ہے" نیز امام شوکانی اپنی تفسیر "القرآن العظیم" جلد 2 صفحہ 215 پر لکھتے ہیں: "یہ 'معلوم فی الاسلام بالضرورة' (وہ علم جس کا جاننا ہر مسلمان پر ضروری ہے مثلاً نماز، روزہ کے احکامات وغیرہ) میں سے ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کے مابین تفریق اور ان کے علاقوں کی تقسیم کو حرام قرار دیا ہے"

چنانچہ مذکورہ بالا بحث میں وارد شدہ احادیث خلافت کو قائم کرنے، اس کی حفاظت کرنے، اس کی وحدت کو برقرار رکھنے اور خلیفہ کی اتھارٹی کو چیلنج کرنے والے کے خلاف قتال کرنے کو فرض قرار دیتی ہیں۔ لہٰذا نہ صرف خلافت کا قیام ایک اولین فریضہ ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو قائم رکھنے اور اس کی حفاظت کرنے کے لئے مسلمانوں کو اپنی جانیں تک نچھاور کرنے کا حکم دیا ہے۔

یہاں میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف واضح انداز میں ہمارے نظام حکومت کا نام بتایا ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ امت میں فقط چار یا پانچ خلیفہ نہیں آئیں گے بلکہ ان کی تعداد کثیر ہوگی۔ ہاں البتہ اسلام کے آغاز میں رشد وہدایت یافتہ خلیفہ تیس سال تک رہیں گے جیسا کہ احادیث میں وارد ہوا ہے۔ یہ حدیث "خلافت راشدہ" کے دور کا تیس سال تک قائم ہونے کی بشارت دیتی ہیں۔ لیکن یہ احادیث اس کی ہرگز نفی نہیں کرتیں کہ خلفاء راشدین کے بعد آنے والے حکمران خلفاء نہ ہونگے۔ جبکہ

مندرجہ ذیل حدیث ان خلفاء کی کثرتِ تعداد پر دلالت کرتی ہے۔ مسلم نے ابو حازم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ''میں پانچ سال تک ابوہریرہؓ کی صحبت میں رہا۔ میں نے انہیں نبی ﷺ سے یہ بیان کرتے ہوئے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((كَانَتْ بَنُوْ اِسرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الاَنبِيَاءُ ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ ، وَاِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعدِي ، وَسَتَكُونُ خُلَفَاءُ فَتَكثُرُ ، قَالُوا: فَمَا تَأمُرُنَا؟ قَالَ: فُوا بِبَيْعَةِ الاَوَّلِ فَالاَوَّلِ ، وَاَعْطُوهُم حَقَّهُم ، فَاِنَّ اللّٰهَ سَائِلُهُم عَمَّا اسْتَرعَا هُمْ)) ''بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کرتے تھے۔ جب کوئی نبی وفات پاتا تو دوسرا نبی اس کی جگہ لے لیتا، جبکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، بلکہ بڑی کثرت سے خلفاء ہوں گے۔ صحابہؓ نے پوچھا: آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''تم ایک کے بعد دوسرے کی بیعت کو پورا کرو اور انہیں ان کا حق ادا کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کی رعایا کے بارے میں پوچھے گا، جو اُس نے انہیں دی''

خلافت تیس سال کے بعد بھی برقرار رہی لیکن ان کو چلانے والے انفرادی طور پر اس مقام پر فائز نہ تھے جو خلفاء راشدین کا تھا نیز اسلامی نظام کے نفاذ میں بھی کمزوریاں دیکھنے کو ملیں۔ اس لئے آپ ﷺ نے پہلے تیس سالہ دور کو ''راشدہ'' کے لاحقے کے ذریعے بقیہ خلافت کے ادوار سے ممتاز فرمایا۔ چنانچہ وہ حضرات جو سمجھتے ہیں کہ خلافت محض تیس سالوں اور چار خلفاء تک محدود تھی وہ مندرجہ بالا حدیث کی روشنی میں اپنی تصحیح کر لیں۔ نیز وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ کہاں لکھا ہے کہ ''خلافت'' ہی مسلمانوں کا نظام حکومت ہے تو وہ بھی اس حدیث سے جان گئے ہوں گے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خبر دی ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی امور کی دیکھ بھال ''خلفاء'' کیا کریں گے۔ نیز مسلمانوں کے لئے یہ حکم صادر فرمایا کہ وہ مسلسل خلافت کو برقرار رکھنے کے لئے ایک کے بعد دوسرے خلیفہ کو بیعت دیتے رہیں۔

جہاں تک خلافت کی فرضیت کے بارے میں کتاب اللہ سے دلیل کا تعلق ہے تو قرآن مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے علاوہ کسی بھی نظام، نظریہ یا قانون کے تحت حکومت کرنے کی سختی سے ممانعت کرتا ہے۔ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ''اور جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ (احکامات) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے لوگ ہی کافر ہیں''۔ (المائدہ :44) مزید ارشاد ہے: ﴿وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ ''اور جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ (احکامات) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے لوگ ہی ظالم ہیں''۔ (المائدہ :44) مزید فرمایا: ﴿وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ ''اور جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ (احکامات) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے لوگ ہی فاسق ہیں''۔ (المائدہ :44) یہ آیات اس میں صریح ہیں کہ اللہ کے قوانین کے ذریعے حکومت کرنا اچھا، بہتر، مندوب یا مستحب نہیں بلکہ فرض ہے۔ قرآن میں وارد شدہ تمام آیات جو ''ما انزل اللہ'' (اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ) کے ذریعے حکومت کرنے کا حکم دیتی ہیں بالواسطہ اس شرعی اتھارٹی اور حکومت کو قائم کرنے کا بھی حکم دے رہی ہیں جو ''ما انزل اللہ'' کے مطابق حکومت کریگی۔ خلافت ہی وہ واحد اسلامی نظام حکومت ہے جسے سنت اور اجماعِ صحابہ سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے ایک حدیث کے ذریعے واضح کر چکا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے نبوت کے بعد کثیر خلفاء کے ہونے کی بشارت دی ہے اور مسلمانوں کو ایک کے بعد دوسرے خلیفہ کی بیعت کر کے اس سلسلے کو قائم رکھنے کا حکم دیا۔ نیز بیعت کی بیشمار احادیث مسلمانوں کو خلیفہ کی اطاعت اور خلافت کے قیام کی تلقین کرتی ہیں۔ جہاں تک ''ما انزل اللہ'' کو جمہوریت، آمریت یا کسی بھی دوسرے نظام کے ذریعے نافذ کرنے کا تعلق ہے تو چونکہ کسی اور طریقہ حکومت کی قرآن، سنت، اجماعِ صحابہؓ اور قیاس جیسے شرعی ماخذ سے کوئی دلیل نہیں ملتی اس لئے ہم ان کی طرف رجوع نہیں کر سکتے۔ اس کی ممانعت ہمیں رسول اللہ کی اس حدیث میں ملتی ہے جس کے مطابق ہر وہ عمل، یا نظام جس کی شریعت سے دلیل نہ ملے مردود ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((كُلُّ عَمَلٍ لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُ نَا فَهُوَ رَدٌّ)) ''ہر وہ عمل جس پر ہمارا حکم نہیں، تو وہ مردود ہے'' چنانچہ معلوم ہوا کہ مندرجہ بالا تمام آیات ہمیں بالواسطہ جس شرعی اتھارٹی کے قیام کا حکم دے رہی ہیں وہ خلافت کے علاوہ اور کوئی نظام حکومت نہیں۔

مندرجہ بالا آیات کے علاوہ بھی کئی آیات ہیں جو مسلمانوں کو ''ما انزل اللہ'' (اللہ کے نازل کردہ) ہی کے ذریعے حکومت کرنے کا حکم دیتی ہیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ﴾ ''پس ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ (احکامات) کے مطابق فیصلہ کریں، اور جو حق آپ کے پاس آیا ہے، اس کے مقابلے میں ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں'' (المائدۃ:48) مزید برآں یہ آیت اس امر میں بھی واضح ہے کہ ہمیں اسلام نافذ کرنے کا حکم ہے نہ کہ لوگوں کی اکثریت یا اقلیت کی خواہشات کی پیروی کرنے کا۔ آج اسلام محض اس لئے ایوانوں سے باہر ہے کیونکہ نام نہاد عوامی نمائندوں کی اکثریت نے اسلام کے قوانین پر مہر ثبت نہیں کی ہوئی۔ ہم سوال پوچھتے ہیں کہ یہ 51% کی رضامندی کی شرط کس نے لگائی ہے؟ جبکہ مندرجہ بالا آیت واضح انداز میں ہمیں حکم دے رہی ہے کہ اللہ کے احکامات کے نفاذ میں لوگوں کی خواہشات کی پابندی کرنا ہرگز جائز نہیں۔ لہذا اس آیت کی روشنی میں واضح ہو گیا کہ جمہوریت وہ نظام حکومت نہیں جس کے قیام کا یہ آیت تقاضا کرتی ہے۔ یہ خلافت ہی ہے جس میں انسانی تعلقات کو منظم کرنے کے لئے درکار قوانین میں کسی قسم کی اکثریت ملحوظ نہیں رکھی جاتی بلکہ خلیفہ انہیں محض نافذ کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ ان قوانین کو اخذ کرنے میں اسلام ہمیں اکثریت و اقلیت نہیں بلکہ قوی شرعی دلیل پر عمل کرنے کا حکم دیتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ '' اللہ اور اس کا رسول ﷺ جب کوئی فیصلہ کریں تو کسی مومن مرد یا عورت کے لیے اس فیصلے میں کوئی اختیار نہیں'' (الاحزاب: 36) یہ آیت جمہوریت کے بنیادی فلسفے ہی کو رد کر دیتی ہے۔ ہاں البتہ کچھ مباح معاملات اور خلیفہ کے چناؤ میں اسلام ہمیں مسلمانوں کی اکثریت یا ان کے نمائندوں کی

اکثریت کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیتا ہے جو دیگر احادیث سے ثابت ہے۔ (اس کی تفصیل جاننے کے لئے ملاحظہ کیجئے حزب التحریر کی کتاب ''اسلام کا نظام حکومت'')

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف خلافت کی موجودگی اور اللہ کے نازل کردہ کے مطابق حکومت کرنے کو فرض قرار دیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو سختی کے ساتھ خبردار بھی کیا ہے کہ کہیں وہ کمپرومائز اور سمجھوتے کی دلدل میں پھنس کر اسلام کے بعض احکامات کو نظر انداز نہ کر بیٹھیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَّعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ﴾ ''اور یہ کہ (آپ ﷺ) ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ (احکامات) کے مطابق فیصلہ کریں اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ اور ان سے محتاط رہیں کہ کہیں یہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ بعض (احکامات) کے بارے میں آپ کو فتنے میں نہ ڈال دیں۔'' (المائدۃ:49) لہٰذا مسلمان تحریکوں کو خبردار رہنا چاہئے کہ وہ کہیں استعمار یا ان کے ایجنٹوں کی خوشنودی کی خاطر، ''قوم کے وسیع تر مفاد میں'' یا سیاست چمکانے کی خاطر **'اللہ کے نازل کردہ بعض'** احکامات پر سمجھوتہ نہ کر بیٹھیں۔ اگر ایسا کیا تو نہ صرف یہ کہ اس دنیا میں کچھ ہاتھ نہ آئیگا بلکہ آخرت میں بھی شرمندگی اور ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اللہ تعالیٰ نے سمجھوتہ کر کے کچھ اسلام کے نفاذ میں تاخیر یا کچھ کو پس پشت ڈالنے والوں کو ان الفاظ میں وعید سنائی ہے: ﴿أَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ، فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ، وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ﴾ ''کیا تم کتاب کے کچھ حصے پر ایمان رکھتے ہو اور کچھ حصے کا انکار کرتے ہو؟ اور جو شخص ایسا کریگا تو دنیا میں اس کے لئے رسوائی ہے اور آخرت کے دن ان لوگوں کو سخت ترین عذاب کی طرف لوٹایا جائیگا'' (البقرۃ:85)

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اولو الامر (صاحبِ اقتدار) کی اطاعت کو بھی مسلمانوں پر فرض کیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا اولوالامر ہونا فرض ہے۔ ارشاد ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ '' اے ایمان والو! اللہ اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولوالامر (حکمرانوں) کی بھی'' (النساء:59) اللہ تعالیٰ کبھی بھی اس شخص کی اطاعت کا حکم نہیں دیتا جس کا وجود ہی نہ ہو۔ چنانچہ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حکمران کا ہونا واجب ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے حکمران کی اطاعت کا حکم دیا تو اس کے وجود کا حکم بھی اسی میں شامل ہے۔ کیونکہ حکمران کے وجود پر شرعی حکم کے پورا ہونے کا دارو مدار ہے اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں شرعی حکم ضائع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا وجود فرض ہے۔

خلافت کے قیام کا فریضہ کتنا اہم ہے اس کا اندازہ ہمیں صحابہ اکرامؓ کی سیرت سے پتہ چلتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کرامؓ نے بھی اسلامی ریاست یعنی خلافت کی بقاء کو ایک اہم ترین فریضہ گردانا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ صحابہ جو آپ ﷺ پر جان چھڑکتے تھے، آپ ﷺ کے وضو کے پانی کو تبرکاً حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے مسابقت کرتے تھے۔ آپ ﷺ کو اپنے نفوس اور اپنے ماں باپ پر فوقیت دیتے تھے، آپ ﷺ کے وصال کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر خلافت کے اہم ترین فریضے میں جُت جاتے ہیں اور آپ ﷺ کے جسد پاک کی تجہیز و تدفین کو مؤخر کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اسلام کسی بھی مسلمان کی وفات کی صورت میں اس کی تجہیز و تدفین جلد از جلد کرنے کا حکم دیتا ہے۔ لیکن اکابر صحابہؓ جن میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عبد الرحمان بن عوفؓ اور سعد بن عبادہؓ شامل تھے انصار کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ سقیفہ بنی ساعدہ میں نئے خلیفہ کے انتخاب کے عمل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ نیز کوئی بھی صحابی انہیں رسول اللہ ﷺ کی تجہیز و تدفین کو تین دن دوراتوں تک مؤخر کر کے خلافت کے قیام میں مصروف ہو جانے پر ملامت یا تنقید کا نشانہ نہیں بناتا۔ صحابہؓ سے بڑھ کر اسلام اور شریعت کو کوئی نہیں جانتا اور نہ ہی ان سے بڑھ کر شریعت کا کوئی پابند ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب تمام صحابہؓ ایک ایسی حدیث جانتے ہوں جس کے مطابق خلیفہ کا انتخاب رسول اللہ ﷺ کی تجہیز و تدفین سے بھی اہم اور فوری فریضہ ہو۔ یہ ہے خلافت کی فرضیت پر اجماعِ صحابہ سے دلیل۔ امام الہیثمی (807ھ) ''صواعق الحراكة'' میں فرماتے ہیں: ''یہ امر سب کو معلوم ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین متفق تھے کہ دور نبوت کے خاتمے پر امام کا انتخاب واجب تھا۔ بلاشبہ انہوں نے اس فرض کو دیگر تمام فرائض پر فوقیت دی اور رسول اللہ ﷺ کی تدفین کی بجائے اس (فرض کی تکمیل) میں جُت گئے۔''

خلافت کی اہمیت اور اس کی فرضیت کی اجماعِ صحابہ سے ایک اور دلیل ہمیں حضرت عمرؓ کے عمل سے ملتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے زخمی ہو جانے کے بعد آپؓ نے لوگوں کے اصرار پر عشرہ مبشرہ میں سے اس وقت حیات چھ صحابہ کو آپس میں سے ایک خلیفہ چننے کے لئے نامزد کیا۔ نیز ان پر حضرت ابوطلحہؓ کی سرکردگی میں پچاس انصار کو متعین فرمایا اور ان کو نہایت واضح انداز میں احکامات صادر فرمائے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوطلحہؓ کو حکم دیا کہ اگر یہ چھ اصحاب میری وفات کے تین دن گزر جانے کے بعد بھی آپس میں ایک

علماء برصغیر کے نزدیک خلافت کی اہمیت

5 اور 6 اپریل 1920ء میں 'آل انڈیا علماء کانفرنس' نے جو قرارداد منظور کی اس کے اہم نکات یہ تھے:

1۔ علماء خلافت کے لئے رائے عامہ قائم کرنے کیلئے کام کریں گے۔

2۔ منافق سکالرز اور وہ جو خلافت کے معاملے کے خلاف ہیں اُن کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔

3۔ علماء اپنے مقتدیوں سے یہ بیعت لیں گے کہ وہ دل و جان سے خلافت کیلئے بولیں گے اور لکھیں گے۔

4۔ مسلمان ہر آئینی الیکشن کا بائیکاٹ کریں گے۔

اُسی سال 19 اور 20 نومبر کو 'آل انڈیا علماء کانفرنس' میں جو قرارداد منظور ہوئی اس کے اہم نکات یہ تھے:

1۔ انگریز مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور مسلمانوں کیلئے اُن کی مخالفت فرض ہے۔

2۔ اِس امت اور خلافت کی حفاظت خالص اسلامی ضرورت ہے۔

خلیفہ چننے میں ناکام رہیں اور تنازع کریں تو پھر اگر پانچ ایک طرف ہوں اور ایک دوسری طرف تو پھر اس ایک کی گردن اڑا دینا۔ اگر چار ایک پر متفق ہوں اور دو تنازع کریں تو پھر ان دو کی گردن مار دینا۔ اور اگر تین تین کا گروہ بن جائے تو پھر عبداللہ بن عمرؓ ثالثی کریں، لیکن اگر پھر بھی تنازع ختم نہ ہو تو پھر دیکھنا کہ عبد الرحمٰنؓ بن عوف کس گروہ کے ساتھ ہیں اور دوسرے گروہ کو قتل کر دینا۔ یعنی اگر اکثریت کے فیصلے کو تسلیم نہ کیا جائے تو ایسی صورت میں جھگڑا کرنے والی اقلیت کو قتل کر دیا جائے۔ گو کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام سرے سے سیاسی اختلاف رائے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اسلام خلیفہ کے چناؤ میں اکثریتی رائے کے ظاہر ہو جانے کے بعد اقلیت کو اس فیصلے کی پابندی کا حکم دیتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ایک مسلمان کا قتل کس قدر بڑا جرم ہے کجا کہ عشرہ مبشرہ میں سے کسی صحابی کا قتل کیا جائے۔ لیکن کسی بھی صحابی نے حضرت عمرؓ کے ان احکامات پر اعتراض نہ فرمایا۔ جبکہ وہ تو لمبی قمیض پر بھی عمرؓ کی سرزنش کرنے سے نہ گھبراتے تھے۔ صحابہؓ کرام کا یہ اجماع اس بات کی دلیل ہے کہ تمام صحابی شریعت کا یہ حکم جانتے تھے کہ خلیفہ کی تقرری تین دن کے اندر اندر ہونی چاہئے اور اگر اس دوران اس فریضے کو پورا کرنے میں کوئی رخنہ ڈالے تو پھر اسے قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خلافت کس قدر بڑا فرض ہے کہ جس کے لئے حضرت عمرؓ نے عشرۂ مبشرہ کے قتل تک کا حکم صادر فرمایا۔

چودہ سو سال تک فقہاء اس فریضے کی اہمیت کو سمجھتے رہے۔ آخر میں میں قرون اولیٰ کے علماء مجتہدین کے اقوال نقل کرنا چاہوں گا تا کہ قارئین کو خلافت کی ''اُم الفرائض'' ہونے میں کوئی شک و تأمل باقی نہ رہے۔ یہ عرض کرتا چلوں کہ فقہی ابحاث میں ''امام'' کا لفظ بھی خلیفہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ ہم رسول اللہ کو بھی احادیث مبارکہ میں امام کا لفظ خلیفہ کے لئے استعمال کرتے ہوئے پاتے ہیں۔

☆امام جزیریؒ (508ھ) **الفقه على المذاهب الاربعة** میں فرماتے ہیں: ''چاروں امام (امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ) اس بات پر متفق ہیں کہ امامت (خلافت) ایک فرض ہے اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ایک امام (خلیفہ) کا انتخاب کریں جو دین کے احکامات نافذ کرے اور مظلوموں کو ظالموں کے خلاف انصاف فراہم کرے۔ مسلمانوں کے لئے دنیا میں بیک وقت دو اماموں (خلفاء) کا ہونا حرام ہے خواہ ایسا باہمی رضا مندی سے ہو یا تنازع کے نتیجے میں''۔

☆امام قرطبی سورۃ البقرۃ کی آیت 30 کی تفسیر میں لکھتے ہیں: یہ آیت امام اور خلیفہ کے انتخاب کے لئے ماخذ ہے، جس کو سنا جائے اور اس کی اطاعت کی جائے۔ کیونکہ دنیا اس کے ذریعے وحدت اختیار کرتی ہے اور خلافت کے قوانین اس کے ذریعے سے نافذ ہوتے ہیں۔ اور اس کے فرض ہونے میں امت اور آئمہ کرام کے مابین کوئی اختلاف نہیں ماسوائے معتزلہ کے۔''

☆امام نوویؒ **شرح المسلم** جلد 12 صفحہ 205 میں کہتے ہیں: ''علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مسلمانوں پر خلیفہ کی تقرری فرض ہے''

☆عبد الحامد بن یحییٰ بن سعید العامری (132ھ) اپنی کتاب ''خلیفہ کو نصیحت'' میں لکھتے ہیں: ''خلافت تمام فرائض کے سر کا تاج اور نگینہ ہے''

☆ابن تیمیہؒ اپنی کتاب **سیاسة الشرعية** کے باب ''حکمران کی اطاعت کی فرضیت'' میں فرماتے ہیں: ''یہ جاننا فرض ہے کہ عوام الناس پر حکومتی اختیارات کا حامل عہدہ یعنی خلافت کا عہدہ دین کے اہم ترین فرائض میں سے ایک ہے۔ درحقیقت دین کا نفاذ اس کے بغیر ناممکن ہے۔ یہی سلف آئمہ کرام مثلاً فضل بن عیاض اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ کی رائے ہے۔''

☆امام غزالی ''**الاقتصاد فی الاتقاد**'' صفحہ 240 میں خلافت کے خاتمے کے ممکنہ نتائج بیان فرماتے ہوئے کہتے ہیں: ''قاضی معطل ہو جائیں گے، ولایات (صوبے) ختم ہو جائیں گے، اختیارات کے حامل افراد کے فیصلوں پر عملدرآمد رک جائے گا اور تمام لوگ حرام کے دہانے پر پہنچ جائیں گے۔''

☆امام ابن حزمؒ (452ھ) ''**فصل من النهال**'' جلد 4 صفحہ 87 میں کہتے ہیں: ''تمام اہل السنہ کا اتفاق ہے کہ امامت کا قیام مسلمانوں پر فرض ہے۔ اور ان پر فرض ہے کہ وہ احکامِ الٰہیہ کے نفاذ کے لئے ایک امام تلے رہیں جو ان کی احکامِ شرعیہ کے مطابق قیادت کرے۔''

☆امام بغدادیؒ (463ھ) ''**كتاب الفَرَق بين الفِرَق**'' صفحہ 210 میں رقمطراز ہیں: ''امت پر امامت (خلافت) فرض ہے تا کہ شریعت کے نفاذ اور اطاعت کے لئے امام مقرر کیا جا سکے۔''

☆امام ماوردیؒ **احکام السلطانیه** صفحہ 56 میں کہتے ہیں: ''امام مقرر کرنا فرض ہے۔''

☆امام ابن خلدونؒ ''**المقدمه**'' کے صفحہ 210 پر کہتے ہیں: ''امام کی تقرری فرض ہے جو صحابہ کرام اور تابعین کے اجماع کی وجہ سے ہر ایک کو معلوم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ مقرر کرنے میں جلدی کی اس کے بعد ہر عہد میں مسلمانوں کا خلیفہ رہا اور وہ کسی بھی دور میں حالت انتشار اور افراتفری میں نہ رہے (یعنی خلیفہ کے بغیر نہیں رہے)۔ اسے ہمیشہ علماء کا اجماع سمجھا گیا ہے کہ امام (خلیفہ) کی تقرری فرض ہے۔''

☆امام ابو عبد اللہ بن مسلم دینوری (276ھ) ''**امامة والسياسة**'' میں لکھتے ہیں: ''خلافت دین و دنیا کے تمام معاملات میں مسلمانوں کے لئے اعلیٰ ترین اتھارٹی ہے۔''

☆امام عبد الحامد بن یحییٰ بن سعید العامری (132ھ) ''**رسالة فی نصيحة و لی العهد**'' میں کہتے ہیں: ''خلافت بہترین زیور ہے جو انمول ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کی پناہ گاہ ہے۔

مذکورہ بالا بحث کے بعد، جس میں قرآن، سنت، اجماعِ صحابہ اور شرعی اصول سے دلائل اخذ کئے گئے تھے، کسی بھی مسلمان کے لئے خلافت کی فرضیت کے بارے میں کوئی شک باقی نہیں رہ جانا چاہئے۔ اس لیے اس کی فرضیت ایسے ہی ہے جیسے نماز، روزے اور دوسرے فرائض کی تو جیسے ان فرائض سے غفلت برتنا حرام ہے بالکل اسی طرح اس فرض کی ادائیگی سے غفلت برتنا بھی حرام ہے۔ اب یہ ذمہ داری ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اس ''اُمّ الفرائض'' کے لئے منہج نبوی کے مطابق سعی اور کوشش کرے تا کہ وہ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکے۔

❁❁❁

امت کی وحدت بذریعہ خلافت یا بذریعہ او آئی سی

اُمِّ مصعب

اسلام آباد میں نومبر کے اوائل میں او آئی سی کے پلیٹ فارم تلے ورلڈ اسلامک اکنامک فورم منعقد کرایا گیا۔ جس میں جنرل مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز بھی جلوہ افروز ہوئے۔ اس کے علاوہ ملائیشیاء کے وزیراعظم عبداللہ بداوی بھی اس فورم میں شامل ہونے کے لئے پاکستان آئے۔ اس فورم کا مقصد مسلم امت اور خصوصاً پاکستان کے عوام کو یہ باور کرانا تھا کہ مسلم لیڈر امت کے اتحاد و وحدت میں کس قدر سنجیدہ ہیں اور اس فکر میں ان کی راتوں کی نیندیں مکمل طور پر اچاٹ ہو چکی ہیں۔ عیدالفطر کی خوشی کو دوبالا کرنے کے لئے ہمارے حکمرانوں نے وہ دن تین مختلف دنوں میں منایا اس پر بھی شوکت عزیز اور او آئی سی کے سیکریٹری جنرل نے اپنے پرزور بیانات کے ذریعے او آئی سی کو اس ضمن میں اپنا کردار ادا کرنے کا عندیہ دیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر نیشن سٹیٹ (قومی ریاستوں) کے مغربی تصور پر قائم یہ نام نہاد اسلامی ریاستیں کیوں امت کی وحدت اور اتحاد کی باتیں کر رہی ہیں؟ سب سے پہلے پاکستان کا نعرہ لگانے والے اور نہایت ہی بھونڈے انداز میں یہ کہنے والے کہ ''پاکستان نے پوری امت کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا'' اب آخر ''امہ، امہ'' کیوں پکار رہے ہیں۔ تو اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ آج پوری امت میں ایک ہونے کی شدید خواہش پیدا ہو چکی ہے۔ آج لاتعداد مسلمان سکالرز، محققین، صحافی، بین الاقوامی امور کے ماہرین اور رسائل و جرائد کے مضمون نگار حضرات انفرادی طور پر اس نتیجے تک پہنچ چکے ہیں کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے اتحاد و یکجہتی کے بنا کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ یا دوسرے لفظوں میں امت کی وحدت، وسائل کے اجتماع اور مسلم فوجوں کو اکٹھا کر کے ہی مسلمان اس دنیا میں بحیثیت قوم باقی رہ سکتے ہیں۔ گزشتہ کچھ عرصے سے پاکستانی اخبارات میں تواتر سے ایسے مضامین اور اداریے شائع ہو رہے ہیں جن میں مسلمانوں کو اتحاد اور یکجہتی کی دعوت دی جاتی ہے تاکہ مل کر اپنے مشترکہ دشمن اور چیلنجز کا مقابلہ کیا جا سکے۔ مگر اس سلسلے میں عملی خاکہ کیا ہو اور یہ مقصد کیسے حاصل ہو، اس بارے میں ابھی تک عوام اور خواص میں اتفاق رائے کا فقدان ہے۔ نیز اس امر کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے کہ آیا مسلم امت کی وحدت موجودہ زبوں حالی کے دور میں محض ایک خوش فہم کا خیالی پلاؤ ہے یا پھر ایک روز بروز قریب سے قریب تر ہوتی ہوئی حقیقت۔

امت کی وحدت کے لئے دو لائحہ عمل اکثر سننے میں آتے ہیں۔ یورپی یونین کی طرز پر مسلم ممالک کا بلاک جو کہ او آئی سی کو فعال بناتے ہوئے وجود میں لایا جائے۔ اس بلاک میں ممالک اپنی سرحدیں، حکومتیں، خودمختاری اور علیحدہ تشخص برقرار رکھیں گے۔ دوسرے لائحہ عمل کے مطابق مسلم ممالک کے درمیان موجود سرحدوں کو گرا کر ایک اسلامی ریاست یعنی خلافت بنائی جائے جس کا ایک ہی حکمران یعنی خلیفہ ہو۔ آیئے ان دونوں تجاویز کا تفصیلی جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ان میں سے کون سا طریقہ کار قابل عمل اور شریعت کے مطابق ہے:

جہاں تک OIC کا تعلق ہے تو گزشتہ پچاس سال سے اس تنظیم کا سوائے امریکی ڈکٹیشن کو ربڑ سٹیمپ کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں۔ یہ حقیقت اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ OIC کو مسلم امت کے ایک ہونے کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے تاکہ مسلمان اس تنظیم کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھتے رہیں اور اس کے اجلاسوں میں چند جذباتی تقریریں اور قرار دادیں پاس کر کے عوام کو بہلایا جائے۔ اب تو عراق و فلسطین کے مسئلے پر امت کے جذبات کی ترجمانی والے چند الفاظ بھی او آئی سی کے اعلامیوں میں نہیں ملتے حتیٰ کہ عراقی و افغانی مسلمانوں کے قتل عام پر امریکہ کی مذمت تک نہیں کی جاتی۔ الٹا مسلمانوں کے قاتل بیوٹن کو وہاں بلا کر اس سے تقریر کروائی جاتی ہے اور مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لئے چیچن مسلمانوں کے قتل عام کی ذمہ دار روسی حکومت کو مبصر کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ پھر اس OIC کا کامیاب ہونا اس لئے بھی ناممکن ہے کہ یہاں وہی مغربی ایجنٹ مسلم حکمران مل بیٹھے ہیں جو پہلے ہی امریکی و یورپی آشیر باد سے حکومتوں پر براجمان ہیں۔ عوام ان سے نفرت کرتے ہیں اور وہ عوام سے نفرت کرتے ہیں۔

مزید یہ کہ متعدد ریاستوں کا ایک بلاک کی صورت میں ہمہ جہت اور متحد ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ یورپی یونین اس ناکامی کی ایک زندہ مثال ہے۔ جبکہ یہ وہ ممالک ہیں جن کے حکمران اپنی قوم کے ساتھ مسلم حکمرانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مخلص ہیں۔ نیز وہ کسی استعماری ملک کے ایجنٹ بھی نہیں ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایک مربوط بلاک بنانے سے قاصر ہیں۔ ان کی ناکامی کی وجہ ہی یہ ہے کہ اپنے اپنے قومی تشخص اور حکومت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک سیاسی، اقتصادی اور عسکری بلاک بنانا ممکن ہی نہیں ہے۔ دراصل قومی ریاست کا تصور اور وسیع تر بلاک کا تصور باہم متناقض تصورات ہیں۔ کوئی بھی ملک اپنے ملکی مفادات کو قربان کر کے بلاک کے مفاد کو ترجیح نہیں دیتا کیونکہ قومی ریاست کے تصور میں قومی مفاد ہر چیز پر مقدم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپی یونین کے رکن برطانیہ، فرانس، جرمنی اور دیگر ممالک کے درمیان ایک کرنسی، متفقہ آئین اور عراق کی صورتحال وغیرہ پر اختلافات موجود ہیں۔

چنانچہ اگر ہم او آئی سی کو فعال بناتے ہوئے ایک مسلم بلاک بنانے کی کوشش کریں تو ایسا کرنا دو وجوہات کی بنا پر ممکن نظر نہیں آتا۔ اولاً مسلم حکمران مغربی غلامی اور ڈکٹیشن کے تحت مسلمانوں کی وحدت نہیں چاہتے۔ بلکہ یہ تو امت میں موجود وحدت کے جذبات کو مجروح کرتے نظر آتے ہیں۔ افغان اور عراق جنگ کے دوران مسلمانوں کو تقسیم کرنے کے لئے ''سب سے پہلے پاکستان'' اور ''سب سے پہلے اردن'' کے نعرے انہی حکمرانوں نے ہی تو دیئے

تھے۔ یہی حکمران ہمیں یہ کہتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں کہ ہم نے امت کا ''ٹھیکہ'' نہیں لے رکھا۔ درحقیقت استعمار کی چاکری میں یہ حکمران ہی مسلمانوں کے درمیان ان مصنوعی سرحدوں کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ نیز یہی حکمران جب چاہتے ہیں استعمار کے مفادات کے لئے ان سرحدوں کو مٹا دیتے ہیں جیسا کہ ہم نے افغان جہاد کے دوران دیکھا جب مسلمان پوری دنیا سے اپنے افغانی بھائیوں کی مدد کے لئے پاکستان اُمڈ آئے۔ ثانیاً یہ کہ مسلم ممالک لامحالہ اپنے اپنے مفادات کو بلاک کے مفادات پر ترجیح دیتے رہیں گے جیسا کہ آج ہمیں یورپ کے ممالک میں دیکھنے کو مل رہا ہے۔ چنانچہ مسلم ممالک کی خودمختاری قائم رکھتے ہوئے اتحاد کی بات کرنا دیوانے کا خواب ہے۔ لہٰذا خودمختار قومی ریاستیں اور استعمار کے ایجنٹ حکمران ہی درحقیقت مسلمانوں کی وحدت میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

اسلام میں قومی ریاست کا کوئی تصور نہیں اور تمام مسلمان ایک امت اور ایک قوم ہیں ان کے درمیان جغرافیائی حدود کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ هَـٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ﴾ ''یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، پس تم میری عبادت کرو''۔ اسی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے
بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی

اور جہاں تک خلافت کے ذریعے مسلمانوں کی وحدت کا تعلق ہے تو یہ وہ سیاسی نظام ہے جو مسلمانوں میں کم وبیش 1300 سال تک برقرار رہا۔ خلافت کوئی زمانۂ رفتہ کا قصہ نہیں یا کوئی بھولی بسری یاد نہیں، بلکہ آج سے محض ایک صدی سے کم عرصہ قبل خلافت ایک جیتی جاگتی حقیقت تھی۔ اس ریاست میں انسان ہی بستے تھے اور ایک مخصوص نظام کے تحت زندگی گزار رہے تھے۔ جس میں اسلام کے نظام عدل، نظام حکومت، اقتصادی نظام سے لے کر خارجہ پالیسی اور تعلیمی پالیسی تک نافذ تھے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ خلافت کن اندرونی کمزوریوں اور بیرونی ریشہ دوانیوں کے باعث اختتام پذیر ہوئی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسلمانوں کی مرکزیت برقرار تھی اور حجاز، عراق، شام، ترکی، مصر، سوڈان اور شمالی افریقہ کے مسلمان ایک ہی امیر تلے متحد تھے۔ اسی مرکزیت کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے برصغیر پاک و ہند کے مسلمان، جو کہ خلافت کا حصہ تک نہ تھے، خلافت کے خاتمے پر چیخ اٹھے اور یہ مصرعہ زباں زد خاص وعام ہو گیا کہ

بولی اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

برصغیر کے مسلمان خوب آگاہ تھے کہ خلافت کمزور سہی مگر بہر حال مسلمانوں کے مفادات کی نگہبان ہے۔ مکہ و مدینہ سے لے کر قبلۂ اوّل تک تمام مسلمان علاقوں کے تحفظ کی وہی ضامن ہے اور خلیفہ ہی وہ ڈھال ہے جس کے پیچھے سے مسلمان کفار کے خلاف جنگ کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے آخری ادوار میں کمزور ترین خلیفہ سلطان عبدالحمید کے وہ تاریخی جملے بھی کوئی فراموش نہیں کر سکتا جب اسے 'ہرڈزل' نے یہ پیشکش کی کہ وہ کچھ مال و دولت کے عوض فلسطین کو فروخت کر دے تو اس پر خلیفہ نے کہا تھا کہ فلسطین کوئی اس کی ذاتی ملکیت نہیں کہ وہ اسے فروخت کرتا پھرے۔ اس کے لئے یہ بہتر ہے کہ اس کے لاش کے ٹکڑے کر دئے جائیں بہ نسبت یہ کہ وہ اسلامی ریاست کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھے۔ ہاں خلافت ختم ہو گئی تو یہ فلسطین تمہیں مفت ہی مل جائے گا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔

حتیٰ کہ جن خلفاء اور والیوں کو عیاش اور ظالم کہا جاتا ہے، تاریخ گواہ ہے کہ ان خلفاء نے تو مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے جان کی بازی تک لگا دی۔ روم میں بیٹھی ایک عورت کی پکار پر معتصم باللہ بے چین ہو گیا اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھا جب تک کہ رومیوں کو ان کی سرکشی کا مزہ نہیں چکھا دیا۔ اسی طرح چند عورتوں کے خطوط پر حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسمؒ کی سرکردگی میں لشکر روانہ کر دیا جس نے ہندو راجہ داہر کو عبرت ناک سزا دی اور مسلمانوں کا وقار بحال کیا۔ خلافت کی موجودگی میں مسلمانوں کی جان و مال محفوظ تھا اور ان کی عزت و آبرو بھی محفوظ تھی۔ غرض وہ دنیا میں بارعب اور معتبر تھے اور آبرومندانہ زندگی گزار رہے تھے۔ خلافت کے خاتمے کے بعد سے لے کر آج تک مسلمان قوم نے جس قدر کسمپرسی کی اور یتیمانہ زندگی دیکھی ہے اس کا سامنا اس کو گزشتہ 1400 سال میں نہ کرنا پڑا تھا۔ ان آٹھ دہائیوں میں لاکھوں مسلمان شہید اور کروڑوں خانماں برباد ہو چکے ہیں۔ قبلہ اوّل چھن چکا ہے، حجازِ مقدس امریکی فوجوں کے سائے میں ہے۔ سمرقند و بخارا کمیونسٹ جابروں کے نرغے میں ہیں۔ اور کشمیر سے لے کر صومالیہ تک مسلمان مجاہدین گوریلا جنگ لڑنے اور جانوں کی بازی ہارنے پر مجبور ہیں۔ یہاں تک کہ فلوجہ و بغداد روز خون میں نہاتے ہیں۔ اور ہمارے موجودہ حکمران نوحہ خواں بھی نہیں ہوتے بلکہ الٹا دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر کافروں کی سیاسی، عسکری اور اخلاقی مدد کرتے نظر آتے ہیں۔

پس نتیجہ یہ ہے کہ امت کے سینۂ فگار میں ایسی آگ لگ چکی ہے اور ایسا لاوا ابل رہا ہے جو آن کی آن میں آتش فشاں بن کر پھٹا چاہتا ہے۔ جب انڈونیشیا میں ہزاروں مسلمان قرآن کی بے حرمتی کے خلاف سڑکوں پر نکلتے ہیں تو افغانستان جیسے زخم خوردہ ملک میں بھی مسلمان احتجاج کرتے اور کفار کی گولیوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اندیجان میں ہزاروں لوگ کریموف کے خلاف سڑکوں پر نکلتے ہیں اور 10 ہزار نہتے شہریوں کو دن دہاڑے قتل کر دیا جاتا ہے جبکہ اخبارات میں 500 سے زائد ہلاکتوں کو چھاپنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ الغرض دنیا کے ہر خطے کا مسلمان انتقام کی آگ میں سلگ رہا ہے۔ بظاہر پرسکون نظر آنے والی سطحِ سمندر کے نیچے طاقتور اور پرجوش لہریں رواں دواں ہیں۔ پوری امت میں چند مشترکہ افکار اور خواہشات پروان چڑھ رہے ہیں۔ ان میں اسلامی نظام قائم کرنے اور مسلمانوں کے دوبارہ ایک ہونے کی خواہش سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ایسے میں خلافت کے قیام اور اسلام کے نفاذ کی پکار ہی امت کے دل کی آواز ہے۔ خلافت نہ صرف وقت کی ضرورت ہے بلکہ مسلمانوں پر اس کا قیام فرض بھی

ہے۔ نیز اسلام مسلمانوں کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہونے کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی ایک سے زائد حکمران کی گنجائش ہے۔ نیز اسلام خلافت ہی کے ذریعے مسلمانوں کی وحدت کو عملاً ممکن بناتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِذَا بُوْیِعَ لِخَلِیْفَتَیْنِ، فَاقْتُلُوا الْآخَرَ مِنْهُمَا)) (صحیح مسلم) "اگر دو خلفاء کے لیے بیعت کی جائے تو ان میں سے بعد والے کو قتل کر دو۔" مزید ارشاد نبوی ﷺ ہے: ((مَنْ أَتَاكُمْ، وَأَمْرُكُمْ جَمِيْعٌ، عَلٰى رَجُلٍ وَّاحِدٍ، يُرِيْدُ أَنْ يَّشُقَّ عَصَاكُمْ، أَوْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ، فَاقْتُلُوْهُ) (صحیح مسلم) "تم کسی ایک شخص پر (امارت کے لئے) متفق ہو اور کوئی شخص آئے اور تمہاری صفوں میں رخنہ ڈالنا چاہے یا تمہاری جماعت میں تفرقہ ڈالے تو اسے قتل کر دو۔"

چنانچہ شریعت کی رو سے ایک وقت میں مسلمانوں کی صرف ایک ہی ریاست کی اجازت ہے۔ جبکہ آج مسلمان 57 ریاستوں میں تقسیم کر دئے گئے ہیں۔ آج ہمارے ایجنٹ حکمران بھارت کے ساتھ سافٹ بارڈر اور سرحدیں گرا کر کنفیڈریشن یا بلاک بنانے کی باتیں تو کرتے ہیں مگر کیا افغانستان، ترکی اور وسط ایشیائی ریاستوں کے ساتھ انہیں کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتی؟ کیا یہاں سرحدیں نعوذ باللہ آسمانی صحیفہ ہیں کہ انہیں گرایا نہیں جا سکتا؟

لہٰذا او آئی سی کے پلیٹ فارم تلے ورلڈ اسلامک اکنامک فورم منعقد کرنے کی ضرورت اس لیے آتی ہے کہ وہ امت کے درمیان تجارت کو فروغ دے سکیں۔ لیکن وہ یہ فروغ WTO جیسی آرگنائزیشنز کے ظالمانہ قوانین اور مسلمان علاقوں کے درمیان نام نہاد ویزے کی پابندیوں کو سامنے رکھتے ہوئے چاہتے ہیں۔ اس کے مقابلے خلافت کے اندر مسلمان علاقے ایک ہونے کی وجہ سے نہ تو مسلمانوں کو آپس میں کسی قسم کی ویزے کی پابندیوں کا سامنا ہوتا ہے اور نہ ہی ان پر WTO کے اندر پائے جانے والے کفر قوانین کا سامنا ہوتا ہے، نتیجتاً نہ صرف تجارت کا فروغ ہوتا ہے بلکہ تجارت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب کسی مسلمان علاقے پر ظلم ہوتا ہے تو او آئی سی کا اجلاس طلب کیا جاتا ہے تا کہ اس ظلم پر غور کیا جائے۔ لیکن ہر ملک آزاد اور ان پر مسلط حکمران جان بوجھ کر صرف اس مسئلے پر غور کرتے رہتے ہیں لیکن کیونکہ وہ علاقہ ان کے ملک کا حصہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی کوئی عملی مدد نہیں کرتے۔ اس کے مقابلے میں خلافت چونکہ تمام مسلمانوں کی ریاست ہوتی ہے اس لیے جب کہیں مسلمانوں پر ظلم ہوتا ہے تو خلیفہ اس کے سدباب کے لیے فوری حرکت میں آتا ہے جس کی مثالیں ہمیں ماضی میں ملتی ہیں، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ معلوم ہوا کہ شریعت مسلم امت کے اتحاد و وحدت کا جو حل پیش کرتی ہے وہ ایک خلافت قائم کر کے ایک امیر کی اطاعت کی صورت میں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کرنا عملاً ممکن ہے یا نہیں۔ اس ضمن میں گزارش یہ ہے کہ اسلام کوئی ایسا عمل فرض نہیں کرتا جو ممکنات میں سے نہ ہو۔ قرآن کی واضح آیت ہے کہ اللہ ایسا کوئی بوجھ اور بھار انسان پر نہیں ڈالتا جو اس کی استطاعت سے باہر ہو۔ چنانچہ اگر یہ اللہ تعالیٰ نے امت پر فرض قرار دیا ہے کہ وہ ایک امیر تلے وحدت اختیار کریں تو یہ یقیناً ممکن ہی ہوگا اسی لئے ایسا کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ دوئم یہ کہ حالات کا بغور جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کے ذریعے مسلمانوں کی وحدت نہ صرف ممکن ہے بلکہ یہ امت کی وحدت کا واحد قابل عمل حل بھی ہے۔

آج امریکہ اور اس کے حواری اس روز بروز قریب ہوتی ہوئی حقیقت سے خوب واقف ہیں۔ کچھ عرصے قبل ہی میں منظر عام پر آنے والی نیشنل انٹیلی جنس کونسل (NIC) (جو کہ سی آئی اے سے منسلک ادارہ ہے) کی رپورٹ Mapping the Global Future میں 2020 تک ایک نئی عالمی خلافت کے ابھرنے کا خدشہ ظاہر کیا گیا ہے اور اس "خطرے" سے نمٹنے کے لئے اپنی حکومت کو تجاویز بھی دی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ قیام خلافت کو روکنے کے لئے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر اسلام کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے۔ نیز مسلم دنیا میں خلافت کے قیام کے لئے سرگرم عمل پرامن سیاسی جماعت حزب التحریر کو دہشت گرد قرار دے کر پابندیاں لگائی جا رہی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف او آئی سی کو کھلی چھٹی دینے کا مقصد یہی ہے کہ مسلم وحدت کے جذبات کو غلط سمت موڑا جا سکے۔ حال ہی میں او آئی سی کی تنظیم نو کے سلسلے میں پیش کی جانے والی تجاویز کا مقصد بھی امت میں اس ادارے کے لئے ایک نئی امید پیدا کرنا ہے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے لئے سلامتی کونسل کی مستقل نشست حاصل کرنے کا کھیل بھی اسی لئے رچایا جا رہا ہے تا کہ مسلمانوں کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ اپنے مسائل کے حل کے لئے بدستور اقوام متحدہ جیسے طاغوت ہی کے دست نگر رہیں جبکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صاف اور واضح الفاظ میں بتا دیا ہے:

﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ﴾ (النساء:60) "اور یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے فیصلے طاغوت (غیر اللہ) کے پاس لے جائیں۔ حالانکہ انہیں حکم ہو چکا ہے کہ اس (غیر اللہ) کا انکار کر دیں۔"

اب وقت آ گیا ہے کہ بازی کا پانسا پلٹ جائے اور مسلم امت کی ایک عظیم اسلامی ریاست یعنی خلافت وجود میں لائی جائے۔ جو علاقائی و گروہی مفادات سے بالاتر ہو کر ایک امیر تلے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کریگی اور پوری انسانیت کو سرمایہ دارانہ نظام کے تسلط اور استحصال سے نجات دلائیگی۔

❁❁❁

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"جس کے دل میں قرآن کا کوئی حصہ نہیں وہ ویران گھر کی مانند ہے"

(ترمذی)

جن خلفاء اور والیوں کو عیاش اور ظالم کہا جاتا ہے، تاریخ گواہ ہے کہ ان خلفاء نے تو مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے جان کی بازی تک لگا دی

اسلام پر کفار کے الزامات اور مسلمانوں کا معذرت خواہانہ رویہ

کفّار نے مغرب میں اپنی ایجادات اور انکشافات کی آڑ میں مسلمانوں کے خلاف فکری یلغار کی تا کہ مسلمان بالکل بے بس ہو جائیں۔ انہوں نے اسلامی ریاست کو ختم کرنے کی خاطر اُن افکار میں ہی شکوک پیدا کئے جن کی بنیاد پر اسلامی ریاست قائم تھی جبکہ مسلمانوں نے ان کے جواب میں جو رویہ اپنایا وہ انتہائی معذرت خواہانہ تھا، جیسے وہ اپنے افکار پر شرمندہ ہوں۔ زیرِنظر مضمون حزب التحریر کی کتاب ''مسلمانوں کو حزب التحریر کی دل سوز پکار'' سے ایک اقتباس ہے جو حزب التحریر کے بانی علامہ تقی الدین النبہانی کی تحریر کردہ ہے۔ اس کتاب میں کفار کی فکری یلغار کا جواب معذرت خواہانہ کی بجائے ایسے دیا گیا ہے جس سے اسلامی افکار مزید شفاف اور کفار کے جھوٹے الزامات کی کجی مزید واضح ہو کر کر سامنے آجاتی ہے۔

سرمایہ دار صرف اِس پر ہی اکتفاء کر کے نہیں رہ گئے بلکہ اُنہوں نے اسلامی جذبات اور احساسات کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اِس طرح اُنہوں نے مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی کا مذاق اُڑایا۔ اُن کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کی اسلامی احکامات سے وابستگی کی وجہ سے تعصب، کٹّر پن، نفرت اور تشدّد پیدا ہوتا ہے، اِسلئے لوگوں کو اسکے خلاف اُٹھ کھڑا ہونا چاہئے۔ اُنہوں نے مسلمانوں کی کفر اور کفّار سے نفرت، اور اسلام اور مسلمانوں سے محبت پر اعتراض کیا۔ اُنہوں نے اِس چیز کو تعصب اور کٹر پن کا نام دیا۔ زر پرستوں کا کہنا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے چاہے وہ اُسے پسند کرے یا نا کرے۔ (یعنی ایک مسلمان اور ایک یہودی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا) کفار کے خیال میں ہر ایک شخص کو اپنی رائے اور مذہب اختیار کرنے کا حق ہے، رائے صرف رائے ہے اِس کو ایک دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ (پھر کیوں مذاہب کے درمیان امتیاز کیا جائے اور انسانوں کے درمیان نفرت اور محبت کو حائل کیا جائے؟) پھر مزید یہ کہ انہوں نے قومی جذبات کو ہوا دی، ترکوں کو عربوں کے خلاف قوم پرستی کی بنیاد پر بھڑکایا، اِسی طرح عربوں کو ترکوں کے خلاف اُکسایا۔ اسلامی جذبات کو اُنہوں نے بدنام کیا، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے تقدّس کو پامال کیا اور کہا کہ یہ سب مذہبی کٹر پن ہے۔ اُنہوں نے اِس بات کی وکالت کی کہ مسلمانوں کو اسلام کی اتنی پرواہ نہیں کرنا چاہئے اور اُسکے احکامات سے اتنا زیادہ لگاؤ مناسب نہیں ہے۔ اِس کو اُنہوں نے مذہبی رواداری کا نام دیا۔ اُن کا یہ سوچنا ہے کہ اگر کوئی قرآن مجید پر تنقید کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے یا صحابۂ کرام پر بہتان تراشی کرتا ہے تو اِس پر مسلمانوں کو جذبات میں آ کر بھڑکنا نہیں چاہئے۔ اُن کا موقف ہے کہ یہ تو ایک عالمانہ بحث کا موضوع ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ مثلاً قرآن مجید حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کرتا ہے جب کہ تاریخ میں ابراہیم نام کا کوئی شخص ہی نہیں ہوا جس سے اِس قصّے کی تصدیق ہو سکے، دوسرے یہ کہ قرآن مجید حضرت محمد ﷺ کی تصنیف تھی لیکن آپ ﷺ نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ اللہ کا کلام ہے تا کہ لوگوں کو اِس کی اتباع کرنے پر آمادہ کیا جا سکے۔ اِسکے علاوہ بھی اُن کا بہت کچھ کہنا ہے اور اُن کا اصرار ہے کہ مسلمانوں کو اِس کذب بیانی پر مشتعل نہیں ہونا چاہئے بلکہ اُنہیں تو یہ سب علمی تحقیق سمجھ کر تسلیم کرنا چاہئے۔ اِس طرح وہ اِس بات کے درپے ہو گئے کہ اس قسم کے جذبات یعنی خوشی، غم، غصّہ، ناراضگی، محبت و نفرت یہ سب اسلامی افکار کے ہی نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اِن جذبات کے پیچھے جو محرّک تھا اُسے اُنہوں نے بدل دیا تا کہ یہ اپنی اسلامی خصوصیت کھو دے۔

بہت ہی منظّم طریقے سے اسلامی افکار، احکام اور احساسات کو اِن لوگوں کی طرف سے چیلنج کیا گیا۔ یہ ایک فطری بات تھی بلکہ ناگزیر تھا کہ مسلمان اِس چیلنج کو قبول کرتے اور عقلی محاذِ جنگ پر کفار کے اِن چیلنجوں کا جواب دیتے، بلکہ یہ مسلمانوں کا دینی فریضہ تھا کہ وہ خود آگے بڑھ کر اِن خرافات کا جواب دیتے اور کفار پر اسلام کی حقانیت واضح کرتے کیونکہ مسلمانوں کی حیثیت حاملینِ دعوت کی ہے اور وہ اِنسانیت کیلئے اللہ کا عظیم الشان پیغام رکھتے ہیں۔ اِسکے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اسلامی افکار کے خلاف اِس قدر پروپیگنڈہ کیا گیا اور اُنہیں اتنا تضحیک کا نشانہ بنایا گیا کہ خود مسلمان ان چیزوں پر شرم اور بے عزّتی محسوس کرنے لگے اور اُنہوں نے اِن چیزوں کے تعلق سے عموماً معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا۔ تعددِ ازواج کا دفاع اِس طرح کرنے لگے کہ یہ تو صرف مخصوص حالات میں بیویوں کے ساتھ عدل کی بنیاد پر مشروط ہے۔ اِس حقیقت سے اُنہوں نے بچنا چاہا کہ اسلام میں طلاق کی اجازت ہے، اِس کو اِس طرح کہنے لگے کہ اسلام اِس کی اجازت نہیں دیتا سوائے کچھ مخصوص حالات کے۔ خلافت کے اوپر جو بھی الزام تراشی کی گئی اُس کو مسلمانوں نے قبول کر لیا اور خاموشی اختیار کر لی، یہاں تک کہ عثمانی دور کے اواخر میں اِس نظام کو ہی تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ خلافت کے خاتمے کے بعد مسلمان اس کا ذکر تک کرنے میں گھبرانے لگے اور سرِ عام اُس کا تذکرہ کرنے کی اُن میں جرأت نہیں رہی۔ یہ جہاد کے مسئلے پر مدافعت پر اتر آئے اور کہنے لگے کہ یہ تو اسلام پر ایک بہتان ہے۔ اِس کا جواب یہ دینے لگے کہ جہاد تو صرف اپنے دفاع میں لڑی جانے والی جنگ ہے، اسلام میں اقدامی جہاد نہیں ہے۔ اِس حقیقت سے اُنہوں نے بچنا چاہا کہ جہاد کفار کے خلاف ایک جنگ ہے کیونکہ یہ اسلام سے انکار کرنے والے ہیں۔ اُنہوں نے قضاء و قدر کا یہ کہہ کر دفاع کیا کہ اسلام نے اِس موضوع پر بحث کرنے سے منع کیا ہے، اِس طرح اُنہیں بے عملی اور بدعملی کی چھوٹ مل گئی۔ اُنہوں نے اِسطرح اسلام پر لگائے گئے الزامات کو قبول کر لیا۔ اُنہوں نے اسلام کا اِس طرح دفاع کیا کہ اِسے کفار کے مقابلہ میں شکست ہی سمجھا

جائیگا۔ اِس شکست خوردگی اور ذلّت کا براہِ راست نتیجہ یہ نکلا کہ جن احکام پر بھی کفار حملہ آور ہوتے گئے، مسلمان اُن اسلامی افکار کے معاملے میں احساسِ کمتری کا شکار ہونے لگے اور اُن کی جگہ سرمایہ دارانہ افکار اور قوانین نے لے لی۔ جہاں تک اُن نئے معاملات اور مسائل کا سوال ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہیں اور اُسی معاشرے کے ساتھ خاص ہیں، اُن کے تعلق سے مسلمانوں نے اسلام سے حل تراشنا چاہا جبکہ یہ مسائل شروع سے نا تو اسلامی نظام کی پیداوار ہیں اور نا ہی یہ ایک اسلامی معاشرے میں پنپ سکتے ہیں۔ اب مسلمان یہ کہنے لگے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کو **المصالح المرسلة** کا اصول اپنانا چاہئے جس کی رو سے عام مصلحت اور فائدے کو ترجیح دی جاتی ہے، اللہ کا قانون اِس کی اجازت دیتا ہے۔ اِن کا یہ کہنا تھا کہ حکمت مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے جہاں بھی وہ اُسے پائے، حاصل کر لینا چاہئے۔ اِسکی بنیاد پر یہ کوشش کی گئی کہ سرمایہ دارانہ نظام جس طریقے سے مسائل کو حل کرتا ہے، اُسے اسلام کو بھی اختیار کرنا چاہئے۔ اِسکو اُنہوں نے اسلامی طریقہ سمجھ کر اختیار کیا جبکہ اسلام اِس ملاوٹ کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔ اِن کا کہنا تھا کہ اسلام میں بیمہ (Insurance) کرانے کی ممانعت نہیں ہے، اِسکا جواز یہ پیش کیا جاتا تھا کہ یہ تو ایک معاہدہ ہے۔ کچھ دوسرے لوگوں کا کہنا تھا کہ اِسکے حرام ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے اِسلئے یہ جائز ہے، کیونکہ ہر وہ چیز جو حرام نہیں ہے وہ مباح ہے، یہ بھی لوگوں کا کہنا تھا کہ بیمہ تو ایک طرح کی ضمانت ہوتی ہے اور اسلام اِسکی اجازت دیتا ہے۔ غیر ممالک سے تجارت کے بارے میں اُن کا کہنا تھا کہ جس کام میں بھی مسلمانوں کا فائدہ ہو وہ انہیں کرنا چاہئے۔ اِس طرح ریاست کو مسلمانوں کا مفاد پیشِ نظر رکھ کر اُس سے فائدہ اُٹھانا چاہئے، یہی **المصالح المرسلة** کا اصول ہے۔ اُنہوں نے پارلیمانی نظام کو یہ کہہ کر جائز قرار دیا کہ یہ تو شوریٰ ہے اور اسلام نے شوریٰ کی اجازت دی ہے۔ اُنہوں نے فرانسیسی دیوانی قوانین کو اپنایا جس میں قانون سازی کے دوران دماغی حالت اور رجحان کی رعایت رکھی گئی ہے، اِس کا جواز یہ پیش کیا کہ اصل معاملہ متن کی روح کا ہے اور اس کا تعلق نیت سے جڑا ہوتا ہے۔ اسلام کی طرف سے اُنہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ اصول ہے کہ معاہدے میں اصل چیز اُسکے مقاصد اور معانی ہوتے ہیں نا کہ اُس کے الفاظ اور فقرے۔ اِس کے ثبوت کیلئے اُنہوں نے اِس حدیث کو پیش کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **اِنّما الاعمالُ بالنیات**۔ کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اِن کا یہ بھی دعویٰ رہا کہ اسلام عام آزادیاں لے کر آیا ہے اور لوگوں کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ اِن کا لحاظ رکھیں کیونکہ اسلام آزادی کا ہی مذہب ہے۔ وہ عیسائیوں کے اس نظریے کو ماننے لگے کہ روحانی پہلو تو روح ہے جو جسم سے مختلف ہوتی ہے اور آدمی روح اور مادّہ دونوں سے مل کر بنتا ہے۔ اِس طرح نا تو روح کو جسم پر حاوی ہونا چاہئے، اور نہ جسم کو روح پر۔ اِس طرح وہ کفار کے چیلنج کے سامنے الجھن کا شکار ہو گئے۔ اُنہوں نے مسائل پر غور نہیں کیا تا کہ وہ کتاب اور سنت کا مطالعہ کر کے اُن کے بارے میں صحیح حل نکالتے اور شرعی حکم معلوم کرتے، اِسکے بجائے اُنہوں نے مغرب کے بتائے ہوئے حل کو ہی اسلامی حل سمجھ کر دل و جان سے قبول کر لیا، محض اِس بنیاد پر کہ اسلام اِس حل کو صراحتاً منع نہیں کرتا۔ کچھ لوگوں نے بعض اماموں کی رائے کو '**المصالح المرسلة**' کے اصول کے تحت قبول کر لیا، نا کہ قرآن و حدیث سے، جس کے کہ وہ پابند تھے۔ سرمایہ دارانہ قوانین کو اِس دعوے کے ساتھ متعارف کرایا گیا کہ یہ اسلامی احکام ہیں۔ اِس کے بعد اب یہ ناگزیر ہو گیا کہ معاشرے میں قوانین اور مسلمانوں کے معاملات اِس طرح چلنے لگے بغیر اِس کا لحاظ کئے کہ وہ اسلامی ہیں یا نہیں۔ اِس طرح سرمایا دارانہ قوانین مسلمانوں میں جاری ہو گئے اور اسلام کو بھلا دیا گیا۔ جب اسلامی افکار کو بدلا گیا تو با آسانی اسلامی احساسات بھی تبدیل ہو گئے۔ اِس طرح اسلامی احکام کو اپنانے میں خود مسلمان کراہیت محسوس کرنے لگے کیونکہ اُنہوں نے اُسے مذہبی تعصب اور شدّت پسندی سمجھا اور یہ بات مسلمانوں میں عام ہو گئی۔ اسلام سے بیزاری اِس حد تک بڑھ گئی کہ لوگوں کی نظر میں کفار اور مسلمانوں کے درمیان اور اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان کوئی فرق ہی باقی نہ رہا۔ سرمایہ دارانہ تصور لوگوں کے دماغ پر بری طرح چھا گیا اور اسلام کے تعلق سے اُن کا جوش و جذبہ ماند پڑ گیا۔ اب قرآن پاک پر کوئی حملہ ہونے کی شکل میں غصّے کا اظہار پسماندگی اور زوال کی نشانی سمجھا جانے لگا، کیونکہ اُنکے نقطۂ نظر سے یہ سب غیر جانبدارانہ علمی تحقیق کے وجہ سے ہو رہا تھا۔ اِس طرح اسلامی حمیّت اور جذبات بالکل ختم کر دیئے گئے۔ اسلامی جذبہ و احساس صرف عبادات اور مخصوص معاملات جیسے کفن دفن وغیرہ تک محدود رہ گئے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور اسلام کی مقابلہ آرائی میں یہ مسلمانوں کی زبردست شکست تھی۔ یہ اسلام کی تقریباً شکست ہی ہوتی، اگر وہ اسلامی افکار جن پر اتنے حملے کئے گئے تھے سچّے اور حق نہ ہوتے یا غلط ہوتے جیسا کہ حملہ آور ظاہر کر رہے تھے، یا پھر سرمایہ دارانہ افکار میں کچھ سچّائی ہوتی، اِسکے برعکس اسلامی افکار تو سراسر سچّائی پر مبنی اور حقیقت کے مطابق ہیں۔ ایسا ہی معاملہ اُن اسلامی احساسات کے ساتھ بھی ہوتا جن پر اتنے حملے کئے جا رہے تھے اگر یہ آدمی کی فطرت کے مطابق نہ ہوتے تو آدمی اِنہیں قبول نہ کرتا۔ اگر معاملہ ایسا ہوتا تو یہ شکست محض مسلمانوں تک ہی محدود نہ رہتی اور اُن کے افکار کا اثر باہمی معاملات اور سیاسی صورتحال بدلنے پر رک کر نہ رہ جاتا بلکہ اِس شکست کے بعد کفار اسلام کا عقلی اور جذباتی وجود ہی ختم کر دیتے جس طرح کہ اُنہوں نے اِسکو سیاسی منظر نامہ سے ہٹا دیا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حقیقت اِسکے

اُنہوں نے مغرب کے بتائے ہوئے حل کو ہی اسلامی حل سمجھ کر دل و جان سے قبول کر لیا، محض اِس بنیاد پر کہ اسلام اِس حل کو صراحتاً منع نہیں کرتا

برخلاف ہے کیونکہ اسلام کے خلاف سرمایہ دارانہ نظام کے تصادم میں شکست مسلمانوں نے کھائی نہ کہ اسلام نے۔ اِسی لئے سرمایہ دارانہ نظام اور کفر کے خلاف اسلام کا حملہ آج بھی اُسی طرح جاری ہے جس طرح اُس وقت جاری تھا جب اُنہوں نے کفر اور کفار کو شکست دی تھی۔ اسلامی افکار اور احساسات وہ عوامل ہیں جو باطل طاقتوں کے خلاف آج بھی نبرد آزما ہیں۔ اِنہیں اسباب سے ہمیں امید ہے، یہی ہمیں ہمارے فتح کے دنوں کی یاد دلاتے ہیں اور اسلام کے احیاء کیلئے جدوجہد کی دعوت دیتے ہیں جو عین انسان کی فطرت کے مطابق ہے، یہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اسلامی دعوت کو ساری دنیا میں پہنچائیں، اِس کو خواہش اور تمنّا سے آگے بڑھ کر حقیقت کا روپ دینے کی کوشش کریں۔

جہاں تک اسلامی افکار کے صحیح و برحق اور سرمایہ دارنہ افکار کے غلط اور باطل ہونے کی بات ہے تو یہ حقیقت اِن افکار سے ہی ظاہر ہے۔ اِس طرح سرمایہ دارنہ افکار جن کی رو سے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا غلط ہے، اور جو یہ کہتے ہیں کہ مرد کو صرف ایک بیوی پر ہی اکتفاء کرنا چاہئے۔ یہ صرف ایک نظریاتی بات ہے اِسکا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا دنیا میں کہیں بھی ایسے معاشرہ کا وجود ہے جس میں ہر مرد کی صرف ایک بیوی ہو؟ دنیا میں ایسے کسی معاشرے کا وجود نہیں ہے جس میں ایسے مرد بالکل نہ ہوں جن کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں۔ فرق یہ ہے کہ کفار جن عورتوں کو اپنے پاس رکھتے ہیں، اُن میں کسی کو پارٹنر، کسی کو گرل فرینڈ اور کسی کو بیوی کا نام دیتے ہیں۔ وہ احکام جو تعدد ازدواج کی اجازت دیتے ہیں کہ کوئی مرد ایک، دو، تین یا چار تک بیویاں رکھ سکتا ہے، شریعت میں اُنکی حیثیت تسلیم کی جائیگی نہ کہ اُنہیں پارٹنر یا گرل فرینڈ بنا کر رکھنے کی۔ کیا یہ انسان کی فطرت کے مطابق اِس مسئلے کا حل بتاتے ہیں؟ یا یہ تعددِ ازدواج کو فطرت کے مطابق سمجھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اِس سے مسئلہ حل ہو جائیگا؟ خاص طور سے جب یہ غیر قانونی طور پر ایک سے زیادہ عورتیں اپنے پاس رکھتے ہوئے اِس پر خاموشی اختیار کرتے ہیں، کیونکہ اِن کے قانون کی رو سے ایک سے زیادہ بیوی رکھ نہیں سکتے۔ یا یہ صحیح ہے کہ یہ اپنی مرضی سے شرعی طریقے اور فطرت کے مطابق زندگی گزاریں؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِمْسَاکٌ بِمَعرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیحٌ بِاِحْسَانٍ﴾

پھر دستور کے لحاظ سے روک لیا جائے یا نیک طریقے سے رخصت کر دیا جائے۔ (سورہ البقرۃ:229)

مرد اُس وقت تک ہی بیوی کو اپنے ساتھ رکھے جب تک اُن میں باہم محبت والفت ہو اور اُن کی زندگی ہنسی خوشی اور سکون سے گزر رہی ہو، اگر اُن میں کسی وجہ سے نااتفاقی ہو اور اُن کا ساتھ میں رہنا دونوں کیلئے پریشانی کا باعث بن رہا ہو تو کیا ایسی حالت میں عورت کو طلاق دینا زوجین کے حق میں مفید نہ ہوگا؟ یا اُن کو زبردستی ساتھ رہنے پر مجبور کرنا جس سے کہ اُن کی زندگی اجیرن اور وہ خودکشی یا قتل پر مجبور ہو جائیں؟

فرق یہ ہے کہ کفار جن عورتوں کو اپنے پاس رکھتے ہیں، اُن میں کسی کو پارٹنر، کسی کو گرل فرینڈ اور کسی کو بیوی کا نام دیتے ہیں

اور حکومت کی حقیقت یہ ہے کہ امت کو اِس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ جس شخص کو مناسب سمجھے یہ ذمہ داری سونپ دے۔ اس اختیار کو استعمال کرنے والا اور احکام پر صحیح طریقے سے عمل کرانے والا کوئی ایک شخص ہی ہوسکتا ہے، ایک سے زیادہ اشخاص کے ہاتھ میں اگر یہ اختیار دے دیا جائے تو پورا نظام درہم برہم ہو جانے کا خطرہ بنا رہیگا۔ تاہم یہ صاحبِ اختیار شخص بھی ایک مخصوص نظام کا پابند رہیگا جس کو وہ صحیح سمجھتا ہے، اِس کی بتائی گئی حدود سے باہر جانے کی اُس کو بھی اجازت نہ ہوگی۔ جو چیزیں اُس شخص کو کنٹرول میں رکھیں گی، اِس نظام پر اُسکا یقین جس کا وہ پابند ہے، مزید یہ کہ اُسکا تقویٰ اور ضمیر اسے حدود سے باہر نہیں جانے دیگا۔ اس سے بڑھ کر وہ امت جس پر وہ حکومت کر رہا ہے اور جس نے اُسے یہ اختیار دیا ہے اُسکے اِس اختیار کو غلط استعمال کرنے پر اسکا احتساب کریگی، اسے زبانی طور پر سمجھایا جائیگا یا غلط کام کرنے کی شکل میں اُسے طاقت سے بھی روکا جائیگا۔ یہ اِس شرط کے ساتھ ہے کہ امت اُس کے کسی بھی حکم کی نافرمانی نہیں کرسکتی چاہے وہ حکم فرض ہو، مندوب ہو یا مباح، لیکن کسی ناجائز یا گناہ کے کام میں وہ اُسکی اطاعت ہرگز نہیں کریگی۔ یہ ہے خلافت کی حقیقت۔ کونسا نظام عملاً صحیح اور حقیقت پر مبنی ہے؟ نظامِ اسلام یا جمہوری نظام، جس کا دعویٰ ہے کہ قوم کو حکومت کرنے کا حق ہے؟ اس دعوے کا عملی نفاذ ناممکن ہے، اِسلئے یہ دھوکے اور فریب کے سوا کچھ نہیں، جمہوریت میں وزیراعظم کو حکومت کے تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور اُسکے وزراء اُسکے معاون ہوتے ہیں۔

اب جہاں تک جہاد کی بات ہے تو مسلمانوں کی طرف سے یہ صفائی پیش کرنا کہ جہاد تو دفاعی جنگ ہے، اپنے آپ میں اسلام پر ایک الزام ہے۔ یہ بات کہنا جہاد کی حقیقت سے ٹکراتا ہے جو کہ رسول اللہ ﷺ کے دور سے اسلامی ریاست کے خاتمے تک جاری رہا۔ مسلمان خود کافروں سے جنگ کرنے میں پہل کرتے تھے اور اِس طریقے کو وہ اسلام کی تبلیغ کیلئے استعمال کرتے تھے۔ یہ مدافعانہ صفائی قرآنِ حکیم کے بھی سراسر خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر اپنے کلامِ پاک میں یہ بات فرمادی:

﴿قَاتِلُوا الَّذِینَ لَا یُومِنُونَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالیوم الآخِرِ وَلَا یُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَ رَسُولُہُ وَلَا یَدِینُونَ دِینَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِینَ اُوْتُوا الْکِتَابَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَن یَّدٍ وَّ ھُمْ صَاغِرُون﴾

"لڑو اُن سے جو نا اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، نا روزِ آخر پر اور نا اللہ اور اُسکے حرام ٹھہرائے ہوئے کو حرام قرار دیتے ہیں اور نا دینِ حق کی پیروی کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اقتدار سے دست بردار ہو کر اور چھوٹے (ماتحت) بن کر جزیہ دینے لگیں" (التوبہ:29) اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: ﴿قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ

بقیہ صفحہ نمبر 22 پر

کیا فقہی اختلافات مسلمانوں کی وحدت میں رکاوٹ ہیں؟

عمران یوسفزئی
imran.yousafzai@yahoo.com

فقہی اختلافات کا طعنہ، سیکولر حضرات کی جیب میں موجود وہ سخت ترین کوڑا ہے جس نے اسلام پسندوں کی کمر کو چھلنی کیا ہوا ہے۔ ابھی کسی کے منہ سے اسلام نافذ کرنے کی بات نکلی نہیں کہ یہ کوڑا حرکت میں آجاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہر قسم کے دلائل ایک ''بم دھماکے'' کے ذکر میں اڑن چھو ہو جاتے ہیں۔ پس میں نے سوچا کہ اس سلسلے میں ایک مدلل اور اصولی جواب تحریر کیا جائے جس میں سیکولر حضرات کو فقہی اختلافات کے سلسلے میں اسلامی ریاست کے طرز عمل کے بارے میں آگاہ بھی کیا جائے اور ساتھ ساتھ اسلام پسندوں کو بھی ایک نصیحت کی جائے۔ کیونکہ صحیح مسلم میں موجود رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے مطابق ''دین نصیحت ہے: اللہ، رسول ﷺ اور قرآن کی خاطر، عوام اور ان کے لیڈروں کے لئے''

جمہوریت میں اختلاف رائے کا مسئلہ حل کرنے کا طریقہ: سب سے پہلے ہم دنیا میں غالب سرمایہ درانہ نظام میں دیکھتے ہیں کہ اس کا سیاسی نظام جمہوریت کیسے اختلافِ رائے کو حل کرتا ہے۔ آج مغربی معاشرے میں اسقاط حمل سے لے کر کلوننگ تک، Stem cell research سے لے کر ہم جنس پرستی تک، اور عراق جنگ سے لے کر ٹیکس اصلاحات تک بے شمار مسائل میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں لیکن یہ ان کے انتشار کا باعث نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جمہوری نظام میں ایک مسئلے پر موجود اختلاف رائے میں سے ایک رائے کو نافذ کرنے کا ایک اپنا طریقہ کار ہے جو اسلام سے مختلف ہے۔ یہ طریقہ عوامی نمائندوں کی اکثریتِ رائے کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ پس اس طریقہ کار کے مطابق وہ اپنے تمام اختلافات کو ریاستی معاملات میں حل کر لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام لوگ ایک ہی رائے اختیار کر لیتے ہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ریاست میں ایک رائے نافذ کر دی جاتی ہے۔ اور بقیہ رائے کے حامل لوگ اپنی رائے کے نفاذ کیلئے سیاسی طریقے سے اپنی آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔ تاوقت کہ اس رائے کے حق میں رائے عامہ ہموار ہو جاتی ہے پس وہ رائے اکثریتی رائے کی بنیاد پر نافذ ہو جاتا ہے۔ اس کی حالیہ مثال امریکہ اور برطانیہ میں ان کی نظر میں 'دہشت گردی' یا دوسرے لفظوں میں اسلام کے خلاف قوانین کی تجدید ہے، جس میں حکومت کو رائے عامہ بنانے میں سخت دشواری کا سامنا ہے۔

اسلام میں اختلاف رائے کے مسئلے کے حل کا طریقہ کار: اسلام میں اختلاف رائے میں ایک رائے نافذ کرنے کا طریقہ کار جمہوریت سے مختلف ہے۔ اسلام کا اس سلسلے میں طریقہ کار یہ ہے کہ شریعت سے اخذ کردہ قوی دلائل کی بنیاد پر کئے جانے والے اجتہادات میں سے خلیفہ جس اجتہاد کو تبنی (Adopt) کر لے اس پر عمل پیرا ہونا واجب ہوتا ہے۔ خلیفہ عبادات، ذاتی معاملات اور عقائد کی فروعی تفصیلات میں کوئی مخصوص اجتہاد نافذ نہیں کریگا اور لوگوں کو اجازت ہوگی کہ وہ ان معاملات میں کسی بھی مجتہد کی تقلید کریں۔ وہ محض اُن مسائل میں ایک اجتہاد کو نافذ کرے گا جن کا تعلق اجتماعی معاملات اور نظام سے ہے مثلاً جہاد کب اور کس کے خلاف کیا جائے، خراج، اقتصادی نظام، تعلیمی پالیسی وغیرہ۔ اس سلسلہ میں جو دلائل قرآن وسنت میں آتے ہیں وہ یہ ہیں: اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ﴾ (النساء:59) ''اے ایمان والو! اللہ اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولوالامر (حکمرانوں) کی بھی۔'' پس خلیفہ اسلامی دلائل پر مبنی رائے میں سے جس رائے کو اختیار کرنے کے بعد لاگو کریگا اس پر تمام مکاتب فکر محض اس لئے عمل کریں گے کیونکہ اس منتخب کردہ خلیفہ کی اطاعت مندرجہ بالا آیت اور دیگر احادیث کی وجہ سے فرض ہے۔ اس دوران عوام اور دیگر مجتہدین اپنی اپنی رائے پر قائم رہ سکتے ہیں، اس کی تعلیم وترویج کر سکتے ہیں اور خلیفہ کو اپنی رائے اپنانے کے لئے مشورہ بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن ان اجتماعی مسائل میں پوری امت کو خلیفہ کے اپنائے گئے اجتہاد ہی پر عمل کرنا ہوگا کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اسی طرح معاشرے اور ریاست کا نظم ونسق بغیر انتشار کے چلایا جا سکتا ہے۔ مشہور فقہی قاعدہ ہے: **امر الامام یرفع الخلاف** ''امام (خلیفہ) کا حکم اختلاف کو ختم کرتا ہے'' اور **أمر الامام نافذ ظاهراً و باطناً** ''امام کا حکم ظاہراً اور باطناً نافذ کیا جاتا ہے'' اسی اصول کے تحت ابوبکرؓ نے اپنی خلافت کے دوران صحابہؓ کی اکثریتی رائے کو مسترد کرتے ہوئے اپنی رائے کو نافذ کیا اور مرتدین زکوۃ، جھوٹی نبوت کے دعوے داروں اور رومیوں کے خلاف ایک ساتھ لشکر کشی فرمائی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے عراق کے مفتوحہ علاقوں پر خراج نافذ کرنے کے اپنے اجتہاد کو نافذ فرمایا اگرچہ حضرت بلالؓ اور اکابر صحابہؓ کا اجتہاد ان سے مختلف تھا۔ نیز جب ابوبکرؓ خلیفہ تھے تو انہوں نے طلاق اور اموال کی تقسیم میں اپنے اجتہادات کا نفاذ کیا جبکہ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں انہی مسائل پر مختلف اجتہادات کو لاگو فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے اس طریقہ کار پر تمام صحابہؓ کا اجماع ہے جو ہمارے لئے شرعی دلیل ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ اجتہادی اختلاف حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کی خلافت کے دوران بھی رہا لیکن اس نے امت میں تعصب یا انتشار پیدا نہیں کیا کیونکہ امت کو اپنے اجتہادی اختلافات حل کرنے کا طریقہ آتا تھا۔

اجتہادی اختلاف کی اجازت کی سنت نبوی ﷺ سے دلیل: صحابہ رسول اللہ ﷺ کے وقت میں اجتہاد کیا کرتے تھے اور ان کی رائے میں اختلاف بھی پایا جاتا تھا۔ یہ اجتہادی اختلاف رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا اور آپ ﷺ نے اس پر کسی کی

ملامت نہ فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے: ((قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الأحذاب لا یصلین أحد العصر إلا فی بنی قریظة فأدرک بعضهم العصر فی الطریق فقال بعضهم لا نصلی حتی نأتیها وقال بعضهم بل نصلی لم یرد منا ذلک فذکر ذلک للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فلم یعنف واحدا منهم)) ''عزوۂ احزاب (کے اختتام والے) دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی بھی نماز عصر نہ پڑھے سوائے بنو قریظہ پہنچ کر۔ بعض حضرات کی عصر کی نماز کا وقت راستے ہی میں ہوگیا۔ ان میں سے کچھ (صحابہؓ) نے تو کہا کہ ہم (راستے میں) نماز نہیں پڑھیں گے جب تک (بنی قریظہ) پہنچ نہ جائیں۔ بعض (صحابہؓ) نے کہا بلکہ ہم (نماز) پڑھیں گے کیونکہ (رسول اللہ ﷺ کے) اس فرمان سے یہ مراد نہ تھی (بلکہ اس حکم سے محض جلدی مطلوب تھی)۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے دونوں میں سے کسی گروہ کی سرزنش نہیں فرمائی'' (بخاری) اس حدیث سے واضح ہوا کہ صحابہؓ کی ایک جماعت نے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے منطوق (لفظی معنی) پر عمل کیا اور دوسرے گروہ نے مفہوم پر اور آپ ﷺ نے کسی کی بھی سرزنش نہیں فرمائی کیونکہ آپ ﷺ کے فرمان کے یہ دونوں معنی سمجھے جاسکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تابعین اور تبع تابعین نے کبھی بھی اجتہادی اختلاف کی بنیاد پر کسی مجتہد کی ملامت کی اور نہ ہی کفر کا فتویٰ لگایا۔ ہاں جنہوں نے قطعی احکامات میں اختلاف کیا ان پر مرتد ہونے کی وجہ سے ریاست نے قتل کی حد جاری کی۔ اسی طرح عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے سنا:

((اذا حکم الحاکم فاجتهد ثم أصاب فله أجران واذا حکم فاجتهد ثم أخطأ فله أجرٌ)) اگر ایک قاضی اجتہاد کرتے ہوئے درست فیصلہ دے تو اس کیلئے دو اجر ہیں تاہم اگر وہ اجتہاد کرتے ہوئے غلط فیصلے پر پہنچ جائے تو اس کیلئے ایک اجر ہے'' (بخاری)

یعنی اگر اجتہاد کی شرائط کے بعد اگر وہ غلط رائے تک بھی پہنچ جائے تو وہ قابل قبول ہے۔

آج خلافت اور خلیفہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان فقہی اختلافات میں سے ایک رائے کو نافذ کرنا ممکن نہیں۔ اسلام کا عملی طریقہ کار حضرت ابوبکرؓ کے دور سے شروع ہو کر عثمانی خلافت تک جاری رہا۔ خلافت تمام مسلمانوں کی ایک ریاست کا نام ہے۔ اور یہ کسی مخصوص گروہ کی خلافت نہیں۔ خلافت کسی مخصوص مسلک کو نافذ نہیں کرے گی۔ بلکہ قوی دلائل کی بنیاد پر کئے جانے والے اجتہادات میں سے درست اجتہاد نافذ کیا جائے گا۔ خواہ وہ کسی عصر حاضر کے مجتہد کی رائے ہو یا اسلام کے مشہور زمانہ تاریخی مجتہدین کی رائے ہو جن کا آج ایک زمانہ مقلد ہے۔ بہرحال اس اصولی بحث کے بعد اگر اس معاملے کا تھوڑی سی گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام کے قطعی احکامات میں کسی بھی مسلک یا اجتہاد میں کوئی فرق نہیں (یہاں پر مغرب کے پروردہ نام نہاد روشن خیال ''علما'' کی بات نہیں ہو رہی۔ جو صرف اپنے خواہش نفس کے مرید ہیں) خواہ اس کا تعلق معاملات سے ہو، عبادات سے ہو یا کہ حکمرانی کے امور سے۔ مزید برآں وہ امور جن کا تعلق ریاست سے ہے ان معاملات میں تو آج امت میں کوئی اختلاف رائے تو کجا دوسری رائے ہی موجود نہیں۔ مثلاً تمام مسلمانوں کی ایک ریاست کا ہونا، خلیفہ کی اطاعت، خلیفہ کا امت کے امور کا ذمہ دار ہونا، ریاست کی طرف سے عوام کے تمام بنیادی ضروریات کی گارنٹی دینا، کفار کے ساتھ فوجی تعاون کا ممنوع ہونا، مسلمان کو کفار کے مقابلے میں بے یار و مددگار نہ چھوڑنا، IMF اور ورلڈ بینک جیسے استعماری اداروں سے قرضہ لینے کی ممانعت، اقوام متحدہ جیسے طاغوت کی رکنیت کا حرام ہونا، عوامی ملکیت جیسے تیل، گیس، کوئلہ، دریا، روڈ وغیرہ کی نجکاری کا حرام ہونا، زمینوں سے متعلق اسلام کی معرکۃ الآرا اصلاحات، کرنسی کا سونے، چاندی یا قیمتی دھات پر منحصر ہونا، حدود کا نفاذ، اقام الصلوۃ، زکوٰۃ کی وصولی، پردہ، خراج وعشر، اسلامی مقبوضہ علاقوں کو کفار کے چنگل سے چھڑانا، سائنس وٹیکنالوجی اور اسلامی ثقافت کی ترویج وغیرہ وغیرہ۔ جہاں تک عبادات اور بعض مسائل کی فروعات اور تفصیلات میں اختلاف کا تعلق ہے تو اس اختلاف کا امت کی وحدت کے امور سے کوئی تعلق نہیں، نہ ہی ریاست کے امور پر اس کا کوئی اثر پڑتا ہے پس اس اختلاف کے باقی رہنے میں کوئی قباحت نہیں، اگرچہ مثبت انداز میں ان معاملات پر بحث و مباحثے کا کلچر پروان چڑھا کر خلافت ایک ایسے معاشرے کو پروان چڑھائے گی جیسا کہ صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین کے وقت موجود تھا۔ اجتہاد سے متعلقہ بنیادی سمجھ ہی تعصب اور دیگر مکاتب اسلام سے بغض کو زائل کرتی ہے کیونکہ دیگر مکاتب فکر بھی دلائل کی بنیاد پر ایک شرعی مسئلے پر کاربند ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں بعض اوقات سیاسی اختلافات کے باعث بدمزگیاں تو ضرور ہوئیں لیکن انھوں نے کبھی بھی فقہی اختلاف کو بنیاد بنا کر جنگ وجدل نہیں کی۔ اسی طرح ہمیں تاریخ سے مختلف مکاتب فکر کے درمیان بیشمار مثبت فکری اور فقہی مباحث ملتے ہیں جن کے نتیجے میں کئی مواقع پر مجتہدین نے اپنے اجتہادات سے رجوع کر کے قوی دلیل پر مبنی اجتہاد کو اختیار کیا۔ نیز حاضرین مجلس کو بھی اپنے فقہی علم میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر مکاتب فکر کے دلائل سمجھنے کا موقع ملتا۔ چنانچہ مختلف مکاتب فکر میں ایک دوسرے کے لئے احترام پیدا ہوتا اور معاشرے میں ہم آہنگی کی

قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں بعض اوقات سیاسی اختلافات کے باعث بدمزگیاں تو ضرور ہوئیں لیکن انھوں نے کبھی بھی فقہی اختلاف کو بنیاد بنا کر جنگ وجدل نہیں کی

فضاء جنم لیتی تھی۔

موجودہ صورت حال: میں اس بات کے اظہار میں کوئی مضائقہ محسوس نہیں کرتا کہ آج امت کے بعض مخصوص طبقوں میں جو رہا سہا مسلکی تعصب تھا وہ بھی دم توڑ چکا ہے۔ عوام الناس نے تو اسے خیر کبھی قبول ہی نہیں کیا۔ اگر عوام کے درمیان فرقہ واریت ہوتی تو اب تک ان میں کئی فسادات ہو چکے ہوتے۔ لیکن یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ جب بھی بم دھماکوں کا کوئی افسوسناک واقعہ وقوع پذیر ہوتا ہے، (جس کے ثبوت کبھی منظر عام پر نہیں لائے جاتے) تو امت دوسرے مسالک کے بجائے حکومت اور بیرونی عناصر پر ہی شک کرتی ہے، کیونکہ امت اس کھیل کو سمجھ چکی ہے کہ آخر اس کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو بعض مخصوص عناصر کو استعمال کرتے ہیں۔ مزید برآں عراق کے اندر انتہائی مقدس مقامات میں دھماکوں کے بارے میں انتہائی واضح شواہد میڈیا میں آ چکے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ اس آگ کو بھڑکانے میں کس قدر گھناؤنہ کردار ادا کر رہا ہے۔ لیکن اللہ کا عظیم احسان ہے کہ اسے منہ کی کھانی پڑ رہی ہے۔

آخر میں علماء کو بھی نصیحت کرنا چاہوں گا کہ وہ امت میں ''صرف ہمارا مسلک درست ہے'' کی ذہنیت نہ ڈالیں۔ بلکہ ان کے سامنے اس حقیقت کو واضح کریں کہ قطعی احکامات میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہو سکتا جبکہ ظنی دلائل میں مختلف مجتہدین قرآن و سنت سے اجتہاد کرتے ہیں۔ اور ہر مجتہد کی بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے حکم تک پہنچ سکے۔ پس اس سلسلے میں اگر اجتہاد کا مکمل طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے تو باقی مسالک بھی اسی طرح اسلام پر چلتے ہوئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم ہی کا اتباع کر رہے ہوتے ہیں جیسے کہ ان کے اپنے مسلک کے لوگ۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے: ﴿و ھوا سمّٰکم المسلمین﴾ ''اور اللہ نے تمھارا نام مسلمان رکھا ہے''

نتیجہ: پس یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہو چکی ہے کہ اجتہادی اختلاف مسلمانوں کی ایک اسلامی ریاست کے راستے میں ہرگز کوئی رکاوٹ نہیں۔ بلکہ اصل رکاوٹ وہ حکمران طبقہ ہے جو اس ایشو کو بھڑکا کر اسلام کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں تاکہ اقتدار پر ان کی گرفت ڈھیلی نہ ہو جائے اور انھیں اپنے کرتوتوں کا حساب نہ دینا پڑے۔

❁❁❁

بقیہ صفحہ نمبر 19 سے

اسلام پر کفار کے الزامات اور مسلمانوں کا معذرت خواہانہ رویہ

وَ لْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً﴾ ان کافروں سے لڑو جو تمہارے قریب ہیں، اور چاہئے کہ وہ تم میں سختی پائیں۔ (التوبہ: 123) اور اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ﴾ اے نبی مومنوں کی کمزوریوں کو دور کرو اور جنگ پر اُبھارو۔ (الانفال: 65) یہ بات ثابت ہوگئی کہ جہاد کفار کے خلاف ایک مادّی جنگ ہے تاکہ اسلامی حکم کو قائم کیا جا سکے۔ کفار کے سامنے واضح طور پر اسلام کی دعوت پہنچانے کے بعد اگر وہ اِس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کریں تو پھر ایسے لوگوں کے خلاف جہاد کیا جائیگا۔ ہر عقیدہ اپنے پیروؤں کو یہی حکم دیتا ہے۔ اس عقیدہ کے حامل افراد مادی طاقت حاصل کرتے ہیں اور مزید یہ کہ اپنے ماننے والوں میں ایک فوجی روح اِس عقیدہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اِس عقیدے کی حامل قوم اِس مادی قوت کی بنیاد پر سیاسی جنگ اور سفارتی حکمت عملی کا نقشہ بناتی ہے تاکہ ایسے حالات پیدا کئے جا سکیں جن میں دعوت کا کام آسانی سے کیا جا سکے اور ریاست کی سیاسی حیثیت میں اضافہ کیا جائے۔ جب مادی تصادم ہوتا ہے تو لڑائی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ یہ صورتحال سرد جنگ کہلاتی ہے جب دو عقائد کو ماننے والے لوگ اپنے اپنے عقیدے کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِن کی مسلح افواج لڑائی کی تیاری کرتی ہیں، یہی عمل ہر جگہ ہوتا ہے۔ اِسی طرح کی صورتحال جرمنی اور نام نہاد آزاد دنیا کے درمیان دوسری عالمی جنگ شروع ہونے سے پہلے پیدا ہوگئی تھی۔ اُس سے پہلے اسلام اور سرمایہ دارانہ نظام کے درمیان یہی صورتحال تھی۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں، یہ زندگی کی ایک حقیقت ہے کہ بہت سے افکار ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں۔ یہ افکار جب مادی شکل اختیار کرتے ہیں تو اِن کو پھیلانے کیلئے اور اِن کے دفاع کیلئے مادی طاقت استعمال کیجاتی ہے اور سیاسی، تمدنی، اقتصادی اور فوجی ذرائع بھی کام میں لئے جاتے ہیں۔ یہ ہے جہاد کی حقیقت۔ یہ وہ لڑائی ہے جو ایک عقیدے کی خاطر سیاسی اور تہذیبی ذرائع استعمال کرنے کے بعد مادی طاقت کے سہارے لڑی جاتی ہے۔ تاہم یہ اسلامی فوج یا جہاد کی روح جرمن فوج کی طرح نہیں ہے جو ایک ایسی فوجی طاقت ہے جس کا مقصد جرمن قوم کو باقی لوگوں سے بالاتر مقام دلانا ہے بلکہ یہ ایک ایسی فوجی طاقت ہے جو اسلامی دعوت کے سامنے آنے والی رکاوٹوں کو دور کرتی ہے تاکہ لوگ آسانی سے اسلام قبول کر سکیں اور باقی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک ایسی امت تشکیل دیں جس میں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر کوئی برتری حاصل نہیں سوائے تقویٰ کی بنیاد کے۔

یہ ہے اِن اسلامی افکار کی حقیقت جنہیں کافر استعمار نے انسانوں کیلئے ایک مسئلہ بنا کر پیش کیا۔ یہ اُن سرمایہ دارانہ افکار کی بھی حقیقت ہے جن کے ذریعہ اسلام کے ان پاکیزہ افکار کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس حقیقت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جن افکار پر حملے کئے جا رہے ہیں وہ کتنے کھوکھلے اور جھوٹے ہیں۔ اِن سچے افکار کے حامل افراد کی ذہنی کمزوری جسکی وجہ سے اُنہیں اِن افکار کو سمجھنے میں دقّت ہو رہی ہے یا وہ اُس کی وضاحت نہیں کر پا رہے ہیں یا وہ اِن پر تنقید سے متاثر ہو رہے ہیں، سے یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ اِن افکار میں کوئی کمی ہے، اور باطل افکار کے حامل افراد کی خوش بیانی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُن افکار سچے ہیں اور نا جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی اِن کی غیر معمولی صلاحیت اِن باطل افکار کو صحیح کر دیگی۔ بلکہ حقیقی افکار تو وہی ہونگے جنہیں انسان کی فطرت قبول کرے اور جو حقیقت کے بھی مطابق ہوں۔ دوسرے الفاظ میں سچ وہ ہے جو حقیقت کے مطابق ہو اور باطل وہ ہے جو حقیقت کے خلاف ہو۔

❁❁❁

شیخ محمد تقی الدّین النبہانی

خاندانی پس منظر

آپ کا پورا نام شیخ محمد تقی الدین بن ابراہیم بن مصطفیٰ بن اسماعیل بن یوسف النبہانی تھا۔ شیخ محمد تقی کا تعلق شمالی فلسطین کے قدیم عرب قبیلہ بنی نبہان سے تھا۔ وہ 1909ء میں فلسطین کے ضلع حیفہ کے ایک گاؤں عجزم میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اسلامی قوانین کے سکالر تھے اور اسلامی قوانین اور شریعہ کے لیکچرار کے طور پر کام کرتے تھے۔ آپ کی والدہ اسلامی علوم میں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اور وہ بھی ایک اسلامی سکالر تھیں۔ آپ کی والدہ نے تعلیم اپنے والد سے حاصل کی جو عثمانی خلافت کے ایک مشہور شاعر، سکالر اور جج شیخ یوسف النبہانی تھے۔ شیخ یوسف النبہانی اپنے زمانے میں بیروت، یروشلم، قسطنطنیہ، موصل اور جنین کی شرعی عدالتوں میں بحیثیت جج مقرر رہے ہیں۔

شیخ تقی الدین نے جس اسلامی ماحول میں آنکھ کھولی اور پلے بڑھے، اُس نے انہیں اپنے آپ کو ایک مکمل اسلامی شخصیت استوار کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ صرف 12 سال کی عمر میں آپ قرآن کریم حفظ کر چکے تھے۔

آپ کے نانا شیخ یوسف النبہانی دور خلافت میں ایک مشہور جج تھے، اور آپ خلافت کی طرف سے جنین کے علاقہ، جو کہ فلسطین کے ضلع نابلس میں ہے، کے قانونی معاملات کے انچارج بھی تھے۔ اسی وجہ سے شیخ یوسف النبہانی کے ترکی، عراق، شام، فلسطین اور لبنان کے بااثر سیاسی شخصیات سے گہرے مراسم تھے۔ اپنے نانا کے انہی تعلقات کی بنا پر شیخ تقی خلافتِ عثمانیہ کے نسبتاً مضبوط حلقہ سیاست میں متعارف ہوئے۔

تعلیم:

اپنے نانا سے حصول تعلیم کے دوران اسلامی علوم میں آپ کی دلچسپی اور ذہانت نے آپ کے نانا کو بے حد متاثر کیا اور آپ کے نانا نے آپ کی اس دلچسپی کو اور دلجمعی کو بڑھانے کے لیے تمام ذرائع بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا۔ لہٰذا قانون میں اپنی ثانوی تعلیم کو حیفہ میں جاری رکھنے کی بجائے شیخ تقی الدین نے قاہرہ کا رخ کیا۔ 1928ء میں قاہرہ میں آپ کا داخلہ بیک وقت جامعہ الازہر اور دارالعلوم کالج میں ہوگیا۔ آپ دونوں اداروں سے فارغ التحصیل ہیں۔ مروجہ تعلیمی نظام کے مطابق آپ نے 1932ء میں ممتاز حیثیت سے بین الاقوامی شریعہ ڈگری حاصل کی۔

جامعہ الازہر میں آپ نصابی کلاسسز کے علاوہ مشہور دانشور شیخ اخضر حسین کے زیر اثر ان کے غیر نصابی حلقہ میں بھی شامل رہے۔ جہاں پر بحث ومباحثہ کے دوران آپ کے جوہر کافی نمایاں ہوئے۔

فلسطین واپسی پر آپ 1932ء سے لیکر 1938ء تک بحیثیت استاد اپنے فرائض انجام دیتے رہے مگر اس دور میں تعلیم کے شعبہ میں موجود بددیانتیوں کے پیش نظر آپ اس سے متنفر ہوکر عدلیہ میں چلے گئے۔ آپ کی نظر میں تمام خرابیوں کی جڑ استعماری مغربی اقوام سے وضع کیا گیا نظام تعلیم تھا۔ عدلیہ آپ کی نظر میں ایک محفوظ جنت سے کم نہیں تھی کیونکہ نظام قانون میں اس وقت تک بھی خلافت کے قوانین کے مطابق فیصلے کیے جارہے تھے۔ آپ نے فلسطین کی شریعت کورٹ میں ملازمت کے لیے درخواست دی جو آخر کار منظور ہوئی اور بیسان، تبریس اور بعد میں حیفہ میں بطور جج مقرر ہوئے۔ آپ 1940ء سے 1945ء تک ماہر قانون ساز بھی مقرر رہے۔ اس وقت سے لے کر 1948ء تک، جب فلسطین پر قبضہ کرلیا گیا، آپ حیفہ کی عدالت میں اعلیٰ مقام پر فائز رہے۔ اس کے بعد آپ فلسطین سے ہجرت کرکے شام چلے گئے مگر کچھ عرصہ بعد ہی آپ کو یروشلم بلا کر اپیل کورٹ میں قاضی کے عہدہ پر مقرر کردیا گیا۔ اس وقت تک یروشلم پر قبضہ نہیں ہوا تھا۔ آپ اس عہدہ پر 1951ء تک فائز رہے۔ 1951ء میں آپ عمان چلے گئے جہاں آپ اسلامی علوم پر استاد مقرر ہوگئے۔

سیاست:

شیخ تقی الدین کی سیاسی مصروفیات کا آغاز کم عمری سے ہی ہوگیا تھا۔ البتہ حزب التحریر کے قیام سے پہلے آپ باقاعدہ کسی سیاسی تنظیم میں شامل نہ تھے۔ البتہ اپنی نوجوانی میں آپ نے مشہور مجاہد اسلام شیخ عزالدین القاسم کی طرف سے برطانیہ کی نوآبادیاتی حکمرانی کا پردہ چاک کرنے اور اسرائیلی ریاست کے قیام کے صیہونی منصوبے کے خلاف ان کی تحریک کی مدد وحمایت کی۔ آپ کی اخوان المسلمین سے بھی ملاقاتیں رہیں اور آپ کا سید قطب کے ساتھ تبادلہ خیال بھی رہا۔ جامعہ الازہر میں آپ کے ابتدائی رفقاء کار آپ کی اسلامی اور سیاسی حلقہ میں آپ کی گہری دلچسپی وحصہ لینے کی گواہی دیتے ہیں اور آپ کی ان سرتوڑ کوششوں کی تعریف کرتے ہیں جہاں آپ اس وقت کے اندرونی حالات کو تنقید کا نشانہ بنانے سے نہ چوکتے جو ان کے نزدیک بالعموم مسلمانوں کے اور بالخصوص خلافت کے زوال کی وجہ تھے۔ آپ نے جامعہ الازہر کے علماء کو بھی مائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ امت اور اس کے امور کی دیکھ بھال کے حوالے سے اپنی کوتاہی برتنے کے طرزِ عمل کو چھوڑ کر اس کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے کوششیں کریں۔

فلسطین واپسی پر آپ کو استعماری ریاستوں جیسے برطانیہ اور فرانس کی طرف سے مسلم امہ کے مغرب کے رنگ میں رنگے جانے کے عمل کو زیادہ نزدیک سے مشاہدہ کرنیکا موقع ملا۔

1948ء میں فلسطین پر قبضہ کے ساتھ عبداللہ الطال کی اردن میں تختہ الٹنے کی ناکام کوشش نے شیخ تقی الدین کو یہ باور کرادیا کہ ایک منظم اور گہرا فکری کام ہی امت کو اس کی کھوئی ہوئی طاقت اور رتبہ واپس دلواسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے 1949ء کے اوائل میں ایک جماعت کی تنظیم، لٹریچر اور اس جیسی دوسری چیزوں پر کام کرنا شروع کردیا جبکہ ابھی آپ بحیثیت جج القدس میں مقرر تھے۔ اپنے پہلے تحریری کام ''فلسطین کا بچاؤ'' جو جنوری 1950ء میں ظاہر ہوا، میں آپ نے ثابت کیا کہ فلسطین میں اسلام کی جڑیں ساتویں صدی سے کتنی مضبوط تھیں۔ آپ نے عرب قوم کے زوال کے اسباب بھی بیان کئے جو آپ کے نزدیک امت کا اپنے آپ کو لالچی مغربی نوآبادیاتی طاقتوں کے حوالے کرنا تھا۔

اگست 1950ء میں آپ نے اسکندریہ مصر میں ہونے والے عرب لیگ کے ثقافتی اجلاس کے نمائندوں کو ایک طبع شدہ خط بھجوایا، جو بعد میں 'عرب قوم کا پیغام' کے عنوان سے کتاب کی شکل میں بھی شائع ہوا۔ اس تحریر میں آپ نے ایک نقطہ پر زور دیا کہ عرب قوم کا حقیقی پیغام صرف اور صرف اسلام ہے کہ جس کی بنیاد پر ہی امت کی فکری بلکہ سیاسی نشاۃِ ثانیہ حاصل کی جاسکتی ہے۔ جب اجلاس کے نمائندوں کی طرف سے اس خط کا کوئی جواب موصول نہ ہوا تو شیخ تقی الدین پہلے سے زیادہ پُر یقین ہوگئے کہ ایک سیاسی جماعت کا قیام ازحد ضروری ہوگیا ہے۔

حزب التحریر:

ابراہیمیہ سکول میں اپنی ملازمت کے دوران ایک سیاسی پارٹی کے قیام کے پیش نظر آپ نے بے شمار شخصیات کو رابطہ کیا جن میں آپ کے رفقاء کار اسد، رجب بعیو دتمیمی، عبدالقدیم زلوم اور کئی دوسرے شامل تھے۔

1952ء کے اواخر اور 1953ء کے اوائل میں تمام معاملات طے پائے اور القدس میں حزب التحریر کا قیام عمل میں آیا۔ شیخ تقی الدین بمع داؤد ہمدان، غنیم عبدوہ، منیر شغیار اور ڈاکٹر عادل نابلوسی نے عثمانی خلافت کے معاشرتی قوانین کے مطابق، جو کہ اس وقت تک نافذ العمل تھا، اردن حکومت کے یروشلم کے گورنر کو ایک نوٹس بھیجا تاکہ انتظامیہ کو جماعت کے قیام کا علم ہوجائے۔ اردن حکومت نے فوری ردعمل ظاہر کرتے ہوئے اس جماعت پر پابندی لگادی اور اس کی سرگرمیوں کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ حزب التحریر نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے القدس، الخلیل، نابلس اور کچھ دیگر علاقوں اور دیہات میں اپنا کام جاری رکھا۔ اس کے بعد حکومت نے پارٹی ممبران کے خلاف سخت اقدامات کئے اور جو آج تک جاری ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ 1954ء میں '' قانون برائے تبلیغ ورہنمائی'' جاری کیا گیا، جس کا مقصد جماعت کے ممبران کو مسجد میں بیان دینے سے روکنا تھا۔ ان سخت اقدامات کے باوجود جماعت نہایت تیزی سے پھیلی اور اس کا کام اکثر مسلم ملکوں تک پھیل گیا حتیٰ کہ دنیا کے بعض دور دراز کے پسماندہ علاقوں تک بھی جماعت کا پیغام پہنچادیا گیا۔

1973ء میں عراق کے ایک سفر کے دوران شیخ تقی الدین النبہانی کو عراق کے سیکورٹی اداروں نے جیل بھیج دیا اور سخت تشدد بھی کیا

1955ء میں جب شیخ تقی الدین ایک مختصر دورے پر بیروت اور دمشق گئے تو حکومتِ اردن نے ایک سخت قانون پاس کرکے آپ کی واپسی کے تمام راستے بند کردیئے۔ آخر کار آپ نے دمشق میں قیام کیا اور بعد میں بیروت چلے گئے اور جماعت کی قیادت کا کام سرانجام دیتے رہے۔

1973ء میں عراق کے ایک سفر کے دوران آپ کو عراق کے سیکورٹی اداروں نے جیل بھیج دیا اور سخت تشدد بھی کیا۔ آپ کو چھوڑنے کی وجہ اُن سیکورٹی اداروں کی آپ کو پہچاننے میں غلطی بنی کیونکہ وہ آپ کو جماعت کا سربراہ کی بجائے ایک عام رکن تصور کررہے تھے۔ بہرحال آپ کی رہائی لبنان کی ایک بااثر شخصیت کی سفارش سے ممکن ہوگئی جو آپ کی اہلیہ کی طرف سے آپ کے رشتہ دار تھے۔

دورانِ حراست شدید تشدد کے باعث آپ جسمانی طور پر کمزور ہوگئے اور بالآخر یہ کمزوری آپ کی وفات پر منتج ہوئی۔ شیخ تقی الدین النبہانی نے 20 دسمبر 1977ء کو بیروت میں وصال پایا اور الازاء قبرستان میں دفن ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا عَلَیہِ رَاجِعُون۔ اللہ تعالیٰ آپ پر ہزاروں رحمتیں برسائے۔ آمین

آپ کی تصنیفات:

شیخ تقی الدین نبہانی ایک عظیم سکالر تھے اور آپ کا اسلام اور مسلمانوں کی صورتحال کے فکری پہلوؤں پر وسیع لٹریچر موجود ہے۔ آپ کی اہم تصنیفات درج ذیل ہیں:

فلسطین کا بچاؤ (1950)
عرب قوم کا پیغام (1950)
معاشرے کے لیے نظام (1950)
نظام الاسلام (1953)
اسلام کا نظام حکومت (1953)
اسلام کا نظام معیشت (1953)
اسلام کا نظام معاشرت (1953)
مفاہیم حزب التحریر (1953)
اسلامی ریاست (1953)
اسلامی شخصیت۔ تین جلدیں۔ (1960)
مقدمہ الدستور (1963)
حزب التحریر کی مسلمانوں کو دل سوز پکار (1965)
خلافت (1967)
حزب التحریر کے سیاسی افکار (1969)
حزب التحریر کے سیاسی تصورات (1972)
تفکیر (1973)
سرعة البدیهة (1976)
کتاب الصلوٰۃ

❁❁❁

ہجرتِ مدینہ کا مقصد اسلامی ریاست کا قیام تھا

عقبہ کی پہلی بیعت اپنے اثر کے اعتبار سے بڑی خیر و برکت کا موجب تھی، کیونکہ باوجود ایک چھوٹی سی جماعت کے جو اس بیعت میں شریک تھے، اُنہیں صرف ایک شخص یعنی حضرت مصعبؓ ابن عمیر کافی ہوئے اور مدینے کے سارے معاشرے کے افکار اور خیالات جو اُن میں عام تھے، اُن میں انقلاب آیا اور وہ بدل کر اسلامی افکار بن گئے جبکہ دوسری طرف مکے میں ایک خاصی تعداد مسلمان ہو چکی تھی لیکن چونکہ معاشرہ اُن سے کٹا رہا، اور کوئی گروہ خاص اسلام میں نہیں آیا، معاشرے پر اسلامی سوچ اور افکار اثر انداز نہیں ہو پائے۔ دوسری طرف مدینہ تھا کہ جہاں لوگوں کی خاصی تعداد اسلام کے دائرے میں آئی، وہاں کے معاشرے پر اسلام اثر انداز ہوا، اہل مدینہ کے خیالات اور احساسات اسلام سے متاثر ہوئے۔ یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ ایسے لوگوں کا ایمان جو معاشرے سے علیحدہ ہوں، اور لوگوں سے کٹے ہوں، نہ وہ معاشرے کو متاثر کرتا ہے اور نہ ہی لوگوں پر اثر انداز ہوتا ہے، چاہے اُن افراد کی کتنی ہی طاقت کیوں نہ ہو۔ اسکے برعکس، اگر حاملین دعوت لوگوں سے جڑے ہوں، تو اِن کے افکار اور خیالات معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور معاشرے کی سوچ اور فکر میں انقلاب برپا کر دیتے ہیں، چاہے اِن جُڑے ہوئے افراد کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اگر ایک معاشرہ کفر کی حالت پر بضد ہو جیسا کہ مکے کا حال تھا، تو یہ زیادہ مشکل ہوتا ہے بہ نسبت اس معاشرے کے جہاں چاہے کفر کے افکار ہوں لیکن وہ لوگوں پر پوری طرح حاوی نہ ہوں، جیسا کہ مدینے کا معاملہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مدینے کا معاشرہ اسلام سے متاثر ہوا اور اپنے سابقہ خیالات اور سوچ کی برائی اور قباحت اُن پر واضح ہو گئی کیونکہ وہ دوسری فکر اور ایک متبادل نظام کے بارے میں سوچتے تھے جو اُن کی زندگیوں کو منظم کر سکے۔ بخلاف اسکے مکے کے لوگ اپنی حالت پر اپنی دانست میں مطمئن تھے بلکہ وہ اپنے افکار کی 'حفاظت' کرتے تھے کہ کہیں اِن میں کوئی تبدیلی نہ آ جائے، خاص طور پر اُن کے سرداران جیسے ابولہب، ابوجہل اور ابوسفیان۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مصعب ؓ ایک قلیل عرصہ میں اسلام کی طرف معاشرے کا رویہ بدلنے میں کامیاب ہوئے اور وہ لوگوں کو دعوت دیتے، اُن کو اسلام کے خیالات اور افکار کی تعلیم دیتے اور لوگوں میں اسلام کی قبولیت کا مشاہدہ کرتے۔ لوگ زیادہ تعداد میں روز بروز اسلام میں داخل ہوتے جس سے حضرت مصعب ؓ کی ہمت میں اور اضافہ ہوتا اور وہ مزید قوت سے دعوت دے پاتے۔

حضرت مصعب ؓ حج کے موسم میں مکہ تشریف لائے اور آپ ﷺ کو مسلمانانِ مدینہ کے احوال بتائے، اُنکی قوت کے بارے میں روشنی ڈالی، مدینے میں اسلام کے پھیلاؤ کا ذکر کیا، اور مدینے کے معاشرے کی تصویر پیش کی کہ وہاں ہر جگہ آپ ﷺ کا ذکر ہے، ماحول میں اسلام چھایا ہوا ہے، مسلمانانِ مدینہ کی قوت کا ذکر کیا جس سے سارے مدینے میں اسلام کا غلبہ ہے۔ بعض ایسے مسلمانوں کی اطلاع دی جن کا اسلام پر ایمان اور اسکی دعوت کو پھیلانے کا جذبہ شدید، ارادہ نہایت مضبوط اور اسلام کا دفاع کرنے کی چاہت ہے اور یہ بتایا کہ یہ لوگ اس سال مکے آنے والے ہیں۔ مدینے کے اِن حالات سے رسول اللہ ﷺ کو بہت مسرت ہوئی اور آپ ﷺ مکے اور مدینے کے ماحول میں فرق پر غور کرنے لگے۔ مکے میں آپ ﷺ نے بارہ سال مسلسل اسلام کی دعوت دی، کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی، جس قدر ممکن تھا محنت کی، ہر قسم کی اذیتیں جھیلیں، اسکے باوجود مکے کے لوگوں کی ہٹ دھرمی اور سرکشی کے باعث دعوتِ اسلام مکے پر وہ اثر مرتب نہ کر پائی جو مطلوب تھا، یہ لوگ اپنی ضد اور اپنے بوسیدہ دین کے تحفظ میں اتنے شدید تھے کہ اِن کے ذہنوں کے دقیانوسی خیالات اسلام کی راہ میں آڑے آ رہے تھے۔ شرک اور بت پرستی کا یہ مرکز تھا اور یہاں کے لوگ اُس پر شدت سے قائم تھے۔ اسکے برعکس مدینے کا عالم یہ تھا کہ ابھی ایک سال پہلے ہی قبیلۂ خزرج کے کچھ لوگوں نے یہ دعوت قبول کی تھی، پھر عقبہ کی پہلی بیعت ہوئی جسکے بعد حضرت مصعب ؓ کی کوششیں۔ اسی سے مدینے کے ماحول میں انقلاب آیا اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ مکے میں اسلام کی دعوت آگے نہیں بڑھ پائی تھی، انہی لوگوں تک آ کر رُک گئی تھی جو مسلمان ہوئے تھے اور انہیں کفار کی شدید آزمائشوں کا سامنا تھا، لیکن مدینے میں مسلمانوں کو وہاں کے مشرکوں اور یہودیوں کی طرف سے مصائب کا سامنا نہ تھا اور دعوت پھیلتی گئی، اس سے اسلام لوگوں کے دلوں میں گہرائی تک رسائی پا گیا اور نئے لوگ بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اب یہ بات آپ ﷺ پر واضح ہو گئی کہ مدینہ ہی زیادہ موزوں اور مناسب ہے، اور اہل مدینہ زیادہ رجحان رکھتے ہیں کہ اسلام کی دعوت کا نور وہاں سے چمکے۔ اس لئے آپ ﷺ نے یہ سوچا کہ ہجرت کر کے مدینے جائیں اور مکے کے مسلمان بھی مدینے میں اپنے بھائیوں میں رہیں، تاکہ ایک طرف تو وہ قریش کی زیادتیوں سے محفوظ، اُن کے مظالم سے دور اور اُن کے جبر سے آزاد رہیں اور دوسری طرف یہ کہ وہ پھر دعوت اسلام کی طرف اپنی توجہ پوری طرح مرکوز کریں تاکہ اسلام اب عملی مرحلہ میں داخل ہو اور لوگوں کی زندگیوں پر اس کا انطباق کیا جا سکے اور اسکی دعوت کو ایک ریاست کی قوت اور اقتدار سے آگے بڑھایا جا سکے۔ یہی ہجرت کا سبب تھا اسکے علاوہ اور کچھ نہیں۔

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ آپ ﷺ نے محض قریش کے مظالم اور اذیتوں سے پریشان ہو کر یا ان پر غلبہ پانے کی کوشش کئے بغیر، یا اُن پر صبر اور استقامت سے ڈٹے نہ رہ کر ہجرت کا فیصلہ کیا ہو، آپ ﷺ تو دس سال مسلسل ان صعوبات اور صبر آزما حالات میں بھی دعوت ہی پر جمے رہے۔ آپ ﷺ اور تمام اصحاب ؓ نے قریش کی ہر تعذیب، ایذا اور دہشت کا سامنا کیا، قریش کی بدسلوکی اور مزاحمت نے کبھی بھی آپ ﷺ یا کسی صحابیؓ کے ارادے کو کمزور نہ کیا، بلکہ اس کے برعکس ایسی حالت میں اُن کا

ایمان اُن کو نئی بلندیوں پر لے گیا اور اللہ تعالیٰ کے وعدے پر یقین نے اُن کے ارادوں اور عزم کو اور مضبوط بنا دیا۔ لیکن اِس عرصے کے تجربات سے بات آپ ﷺ پر واضح ہو گئی تھی کہ مکے کا معاشرہ کس قدر کٹر اور تنگ نظر ہے اور اہل مکہ کتنے سنگدل اور گمراہ ہیں۔ نتیجتاً یہاں دعوت کی کامیابی کے امکانات کتنے کم ہونگے اور یہ اپنی کوششیں اور محنتیں ضائع کرنے کے مترادف ہوگا، چنانچہ یہ ضروری ہے کہ اس معاشرے سے نکل کر کسی اور جگہ اپنی کاوشیں اور محنت مرکوز کی جائے، اسلئے آپ ﷺ نے مکے سے ہجرت کرنے کا سوچا اور بس صرف یہی وجہ تھی کہ مدینے ہجرت کی جائے۔ نہ کہ قریش کے ظلم اور تشدد سے خود کو محفوظ رکھنے کیلئے۔ حالانکہ اس سے قبل ایسا ہوا تھا کہ آپ ﷺ نے اپنے بعض اصحاب ؓ کو قریش کے ظلم و زیادتیوں سے بچنے کیلئے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک مسلمان کو اجازت ہے کہ اگر اس پر اسکے دین کی وجہ سے مظالم اور زبردستی ہو رہی ہو تو وہ کہیں اور ہجرت کر جائے حالانکہ تعذیب برداشت کرنا، ایمان میں اضافہ کرتا ہے، جور اور ظلم سے خلوص میں نکھار آتا ہے، مزاحمت سے عزم اور ارادہ قوی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان سے چیزوں کی بے وقعتی دلوں میں گھر کرتی ہے اور اللہ کی راہ میں آنے والی مشکلات کا سامنا کرنا آسان ہوتا ہے، مومن اپنی جان، مال اور دل کا سکون تک قربان کردینے پر آمادہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کا ایک دوسرا بھی رخ ہے کہ مومن اِن مصائب کا سامنا کرنے اور قربانیوں پر تیار رہنے میں اتنا مشغول ہو جاتا ہے کہ اسکی ساری کوششیں اسی پر مرکوز رہتی ہیں نہ کہ اپنے دین کی اشاعت اور دعوت پر، دیگر یہ کہ وہ اپنے ضابطۂ حیات کی سچائی اور حق پر اتنا غور نہیں کر پاتا کہ اس کی فکر وسیع ہو سکے۔ اسی لئے یہ ناگزیر تھا کہ فتنے کی جگہ سے ہجرت کا حکم دیا جاتا۔ یہ تو معاملہ تھا حبشہ کی ہجرت کا، لیکن مدینے کی ہجرت کا معاملہ مختلف تھا، اس سے مقصود یہ تھا کہ اسلامی فکر اور اللہ کے پیغام کو اپنی نئی جگہ لوگوں میں ایسا ڈھال دیں کہ ایک نیا معاشرہ تیار ہو جو اللہ تعالیٰ کی اس دعوت کو ساری دنیا میں پھیلا سکے اور اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ یہ وہ فکر تھی جو آپ ﷺ کو مدینے ہجرت کی طرف مائل کر رہی تھی۔ لیکن قبل اسکے کہ آپ ﷺ خود ہجرت کرتے یا اپنے صحابہ ؓ کو حکم دیتے، یہ ضروری تھا کہ آپ ﷺ مدینے سے آئے ہوئے حاجیوں سے، اُن میں موجود مسلمانوں سے ملیں اور یہ محسوس کریں کہ اہل مدینہ کس حد تک دین اسلام کی حمایت کیلئے تیار ہیں، اسلام کی راہ میں کہاں تک قربانیاں دے سکتے ہیں، اور یہ دیکھیں کہ کیا وہ آپ ﷺ کے ہاتھ پر جنگ اور قتال کی بیعت کرنے کو تیار ہیں؟ کیونکہ اسلامی ریاست کے قیام کیلئے یہی سنگ بنیاد ہوگا۔ آپ ﷺ نے حاجیوں کی آمد کا انتظار کیا، یہ بات بعثت نبوی کے بارہویں سال یعنی 622ء کی ہے۔ حاجیوں کی تعداد کافی تھی اور ان میں 75 مسلمان تھے، جن میں دو عورتیں تھیں، ایک نسیبہ ؓ بنت کعب یعنی ام عمارہ جو بنی مازن بن النجار سے تھیں اور دوسری اسماء بنت عمرو بن عدی یعنی ام منیع جو بنی سلمہ سے تھیں۔ آپ ﷺ نے اِن لوگوں سے رازداری سے رابطہ کیا اور اِن سے ایک اور بیعت کے بابت بات کی جو محض دعوت کو پھیلانے اور حملے کی صورت میں دفاع پر اکتفاء نہ کرتی تھی بلکہ اس کے بڑے دوررس مضمرات تھے، یہ ایک ایسی بیعت ہونا تھی جو ایک ایسی قوت کو شکل دے سکے جو ایک طرف تو مسلمانوں کے دفاع کیلئے کافی ہو اور دوسری طرف یہ قوت ایک ریاست کا سنگِ بنیاد ہو جو اسکی حفاظت کر سکے، ایک ایسی طاقت جو اسلامی دعوت اور اسلامی احکام کے نفاذ کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو مادّی قوت سے ہٹا سکے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اُن سے اس بیعت پر بات کی تا کہ اُن میں امور کی استعداد محسوس کر پائیں۔ مدینے کے حاجیوں نے ایامِ تشریق کے درمیان ایک شب آپ ﷺ سے عقبہ کے مقام پر ملنے کا وعدہ کیا۔ آپ ﷺ نے اُنہیں ہدایت دی کہ جب وہ آئیں تو کسی سوتے کو نہ اُٹھائیں اور نہ کسی شخص کا جو غائب ہو انتظار کریں۔

مقررہ شب جب ایک تہائی سے زیادہ گزر گئی تو وہ حضرات بڑی احتیاط سے عقبہ کی طرف آپ ﷺ سے ملاقات کیلئے روانہ ہوئے، اُن کے ساتھ دونوں خواتین بھی تھیں۔ یہ لوگ دبے پاؤں مع اپنے سامان کے عقبہ کے پہاڑ پر چڑھ گئے تا کہ ان کا یہ معاملہ راز رہے۔ ان لوگوں نے وہاں پہنچ کر آپ ﷺ کا انتظار کیا تاوقتیکہ آپ ﷺ حضرت عباس ؓ کے ساتھ تشریف لائے جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ حضرت عباس ؓ اسلئے ساتھ آئے تھے کہ اطمینان کر لیں کہ اُن کے بھتیجے یعنی رسول اللہ ﷺ کسی خطرے میں تو نہیں پڑ رہے اور آپ ہی نے گفتگو کا آغاز کیا فرمایا:

"اے اہل خزرج! تمہیں معلوم ہے کہ محمد ﷺ کا ہم میں کیا مقام ہے۔ ہم نے اپنے ہی لوگوں سے ان کی حفاظت کی ہے اور وہ بھی ایسا ہی احترام کرتے ہیں۔ محمد ﷺ اپنی قوم میں عزت اور حفاظت سے رہتے ہیں لیکن اُنہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ تمہارے پاس آ جائیں، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ جو وعدہ تم نے اُن سے کیا ہے اس کو پورا کرو گے اور اُن کی دشمنوں سے حفاظت کرو گے تو اُنہیں لے جاؤ، اور اگر تم اُنہیں چھوڑ دو گے اور ان سے کیا وعدہ پورا نہ کرو گے تو تم اُنہیں چھوڑ دو"۔

اُن لوگوں نے جواب دیا: "ہم نے سن لیا جو آپ نے کہا، اے اللہ کے رسول ﷺ اب آپ ﷺ فرمایئے اور اپنے لئے اور اپنے ربّ کیلئے جو پسند ہو وہ فیصلہ کیجئے" آپ ﷺ نے پہلے کچھ آیاتِ قرآنی تلاوت کیں، پھر اسلام کیلئے رغبت کی بات کی اور فرمایا: "(أبايعكم على أن تمنعوني مما تمنعون منه نسائكم و ابنائكم)" یعنی میں اس بات پر تمہاری بیعت لیتا ہوں کہ تم جس طرح اپنی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرتے ہو اسی طرح میری حفاظت بھی کرو گے" سب سے پہلے البراء نے پہل کرتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ہم بیعت کرتے ہیں، اللہ کی قسم ہم جنگجو قوم ہیں اور ہمارے پاس اسلحہ ہے جو ہمارے باپ دادا سے ورثے میں ملا ہے۔ اس سے پہلے کہ البراء کی بات ختم ہوتی، ایک شخص ابوالهیثم ابن التیھان نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا کہ اے اللہ رسول ﷺ ہمارے ساتھ دوسروں کا (یہودیوں کا) معاہدہ ہے، ہم اسے توڑ دیں اور پھر اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو فتح دیدے اور آپ پھر اپنی قوم میں لوٹ آئیں اور ہمیں چھوڑ دیں؟" اس پر آپ ﷺ مسکرائے اور فرمایا: "تمہارا خون میرا خون ہے، جو تمہیں عزیز ہے وہ مجھے عزیز ہے، تم مجھ میں سے ہو اور میں تم میں سے، میں اُس سے مقابلہ کرونگا جو تم سے لڑے اور اُس سے میری صلح ہوگی جو تم سے صلح کرے" العباس ابن عبادہؓ نے خزرج کو مخاطب کیا اور کہا "کہ اے لوگو! کیا تمہیں احساس ہے کہ تم یہ بیعت کر کے خود کو کس وعدے کے سپرد کر رہے ہو؟ اس کا مطلب ہے ہر ایک سے لڑنا، اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس تمہارے مال و اثاثے تم

سے چھوٹ جائیں گے اور تمہارے عزت دار لوگ مارے جائیں گے پھر تم اِن (یعنی رسول اللہؐ) کو چھوڑ دو گے تو بہتر ہے تم یہ ابھی کر دو کیونکہ بعد میں آپ ﷺ کو چھوڑ دینے کا مطلب ہوگا کہ اس دنیا میں اور آخرت میں شدید رسوائی۔ لیکن اگر تمہیں یقین ہے کہ تم ان سے وفا کرو گے چاہے تمہارے مال و اثاثے لٹ جائیں اور تمہارے اشراف مارے جائیں تو پھر انہیں یعنی رسول اللہ ﷺ کو لے چلو اس میں تمہارے لئے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی نفع ہی نفع ہے" اس پر سب لوگوں نے حامی بھری اور آپ ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول اگر ہم آپ ﷺ سے وفا کریں تو ہمارے لئے اس وفا کا کیا صلہ ہے؟ آپ ﷺ نے نہایت اطمینان اور اعتماد سے فرمایا: جنت!

اس پر سب لوگوں نے اپنے ہاتھ بڑھا دیئے اور یہ کہتے ہوئے عہد کیا: "ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی مکمل اطاعت میں ہم ہر حال میں لڑینگے، چاہے مشکلوں میں ہوں یا خوشحالی میں، تنگ حال ہوں یا برے حالات میں، ہم کسی کے ساتھ برا نہیں کرینگے، ہر حال میں حق بات بولیں گے، اللہ کے معاملے میں ہم کسی قسم کا خوف نہیں کرینگے" آپ ﷺ نے ان سے اُن کے بارہ افراد طلب کئے جو اُن لوگوں کے معاملات کے کفیل ہوں۔ اہل مدینہ نے نو افراد قبیلہ خزرج اور تین قبیلہ اوس کے آگے بڑھائے، آپ ﷺ نے اِن نقیبوں سے فرمایا کہ جس طرح عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے نقیب تھے جو اُن کے ذمہ دار تھے، اسی طرح تم بھی اپنی قوم کے کفیل ہو جیسا کہ میں اپنی قوم کا۔ اس کے بعد اہل مدینہ اپنے سامان کی طرف لوٹ گئے اور مدینے کی طرف واپسی کی۔ اس بیعت کے بعد آپ ﷺ نے مسلمانانِ مکہ کو حکم دیا کہ وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ہجرت کر کے مدینے چلے جائیں۔ مسلمان یا تو الگ الگ یا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں مدینے کی طرف روانہ ہونے لگے۔ قریش کو جب اس بیعت کی بھنک لگی تو اُنہوں نے کوششیں کیں کہ مسلمانوں کو ہجرت نہ کرنے دیں اور اسکے لئے اُنہوں نے یہ تدبیر تک آزمالی کہ اگر شوہر ہجرت کر رہا ہے تو بیوی کو روک لیں، لیکن مسلمان بہر حال روانہ ہوتے رہے۔ آپ ﷺ مکے ہی میں رہے اور یہ بات ظاہر نہ ہونے دی کہ آیا آپ ﷺ بھی ہجرت کا ارادہ رکھتے ہیں یا مکے ہی میں قیام کریں گے۔ البتہ حضرت ابو بکرؓ ہی ایک ایسے شخص تھے جنہیں یہ اندازا تھا کہ آپ ﷺ بھی ہجرت کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ بار بار آپ ﷺ سے ہجرت کی اجازت طلب فرماتے رہے اور رسول اللہ ﷺ اُنہیں جواب دیتے کہ جلدی مت کرو، ممکن ہے کہ اللہ تمہارے لئے ساتھی کر دے۔ اس سے حضرت ابو بکر کو یقین ہوا کہ آپ ﷺ بھی ہجرت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ قریش کو ادھر یہ فکر لگی تھی کہ ایک تو مدینے میں پہلے ہی مسلمانوں کی بڑی تعداد ہے، اور وہاں انہیں کا بول بالا ہے، پھر مسلمان وہاں پہنچ رہے ہیں، ایسے میں رسول اللہ ﷺ کے ہجرت کرنے کے نتائج قریش کیلئے خوش آئند ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ ﷺ کتنا بڑا خطرہ ہیں، اگر آپ ﷺ مدینے ہجرت کر جاتے ہیں تو مسلمانوں کی طاقت میں اس اضافے کا مطلب قریش کا خاتمہ ہوگا۔ چنانچہ قریش نے بڑا غور فکر کیا کہ کس طرح آپ ﷺ کو مدینے ہجرت کرنے سے روکا جائے۔ دوسرا قریش کو یہ خوف بھی تھا کہ اگر رسول اللہ ﷺ مکے ہی میں رکتے ہیں تو مسلمانوں کی مدینے میں طاقت ہونے کے باعث وہ آپ ﷺ کا دفاع بھی کر سکتے ہیں، اسلئے آخر میں اُنہوں نے طے کیا کہ حضور ﷺ کا (نعوذ باللہ) قتل کر دیا جائے تا کہ وہ ہجرت نہ کر سکیں اور آئندہ کیلئے مسلمانوں سے جنگ کا کوئی امکان نہ رہ جائے۔

سیرت کی کتب میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ابو امامہ بن سہم سے روایت ہے کہ جب بیعتِ عقبہ کے بعد وہ لوگ چلے گئے اور مسلمان ہجرت کی تیاری کرنے لگے تو قریش کی طرف سے اُن پر اذیتیں اور تعذیب اور بڑھا دی گئیں، جس پر صحابہ نے آپ ﷺ سے شکایت کی اور آپ ﷺ نے جواب دیا کہ میں نے تمہیں تمہارا نیا وطن بتا دیا، سو اب وہاں کیلئے خروج کرو۔ ایک بار آپ ﷺ قدرے خوش نظر آئے اور فرمایا کہ مجھے خبر دی گئی ہے کہ تم لوگ اپنی نئی جگہ ہجرت کر سکتے ہو اور یہ یثرب (مدینہ) ہے، سو جو چاہے وہ ہجرت کر سکتا ہے۔ لوگ مدینے ہجرت کرنے لگے کوئی اکیلے کر رہا تھا اور کوئی بہت تھوڑے لوگ مل کر قافلے کی شکل میں لیکن نہایت رازداری سے۔ حضور ﷺ مکے ہی میں رہ کر اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کر رہے تھے، حضرت ابو بکر صدیق آپ ﷺ سے ہجرت کی اجازت طلب فرماتے تو آپ ﷺ یہی کہتے کہ کیوں جلدی کرتے ہو ممکن ہے اللہ تمہارے لئے ساتھی دیدے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ امید کرتے کہ یہ ساتھی خود آپ ﷺ ہی ہوں۔ قریش نے جب دیکھا کہ اصحابِ رسول ہجرت کر رہے ہیں تو اُنہیں یقین ہو گیا کہ آپ ﷺ اُن سے جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں چنانچہ قریش دار الندوہ میں جمع ہوئے اور اس بات پر اتفاق کیا کہ آپ ﷺ کا (نعوذ باللہ) قتل کر دیا جائے۔ حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور آپ ﷺ کو قریش کے مذموم عزائم کی اطلاع دی اور یہ کہا کہ آپ ﷺ آج شب اپنے اُس بستر پر نہ سوئیں جس پر وہ روز سوتے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ آپ ﷺ بھی ہجرت کر جائیں۔

مدینے میں مسلمانوں کی خاصی طاقت، اہل مدینہ کی استعداد کہ وہ آپ ﷺ کا استقبال کریں اور ایک اسلامی ریاست قائم کریں، یہی وہ وجوہات تھیں جو آپ ﷺ کی ہجرت کا محرک تھیں۔ یہ ایک نہایت خطرناک غلطی ہوگی کہ اس بات پر یقین کیا جائے، یا اس کا ہلکا سا بھی شک ہو کہ آپ ﷺ قریش کے ذریعہ قتل کئے جانے کے خوف سے ہجرت پر آمادہ ہوئے۔ آپ ﷺ کبھی بھی قریش کے مظالم کو، یا اُن کے ذریعہ دی گئی اذیتوں کو خاطر میں نہیں لائے بلکہ اسکے برعکس آپ ﷺ ہمیشہ اس بات کیلئے تیار تھے کہ اللہ کے دین کی راہ میں اپنی جان قربان کر دیں، بس یہی حقیقت ہے۔ آپ ﷺ کی ہجرت اس بے لوث جذبے کے تحت ہوئی کہ اسلامی دعوت کو آگے بڑھایا جائے، ایک اسلامی ریاست قائم کی جائے جس سے دعوت کے کام کو پھیلایا جا سکے۔ قریش کا آپ ﷺ کو قتل کرنے کا فیصلے اس غرض سے تھا کہ آپ ﷺ مدینے ہجرت نہ کر پائیں جہاں آپ ﷺ کو اقتدار اور حمایت حاصل ہوتی۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں ناکام ہوئے، جیسا کہ قریش کو خوف تھا۔ ہجرت، اسلام کی دعوت کی تاریخ میں میں ایک نیا موڑ ثابت ہوئی۔ اب لوگوں کو اسلام کی طرف بلانے کے مرحلے کے بعد ایک اور مرحلہ تھا وہ یہ کہ ایک اسلامی معاشرہ تشکیل دیا جائے، ایک ریاست بنائی جائے جس کا اقتدار اسلام سے ہو جو لوگوں کو دلیل و برہان، ثبوت اور رغبت دلا کر اسلام کی طرف مائل کرے اور ایک قوت ہو جو اس عمل کو ہر شیطانی اور شر کی قوت سے محفوظ کرے۔

❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''بیکر ہملٹن کمیشن رپورٹ'' کا مقصد عراق کی صورتِ حال سے امریکہ کو نکالنے کے لیے امریکی ایجنٹوں کو متحرک کرنا اور ''نئے مشرقِ وسطیٰ'' کے امریکی منصوبے کو دوبارہ زندہ کرنا ہے

6 دسمبر 2006 کو امریکہ کے بیکر ہملٹن کمیشن (Baker Hamilton Commission) نے عراق کے متعلق اپنی رپورٹ شائع کی جس کا عنوان یہ تھا: The way Forward - A New Approach بیکر ہملٹن رپورٹ کی تجاویز میں سے سب سے نمایاں تجاویز یہ تین ہیں:

1) رپورٹ میں ''عراق کے مسائل سے نبٹنے کے لیے نئے جامع سفارتی لائحہ عمل'' کی بات کی گئی ہے، جو کہ ''بین الاقوامی گروہ برائے تعاون'' کے قیام کے ذریعے عراق میں استحکام قائم کرے گا، اور اس گروہ کا کام یہ ہوگا کہ یہ سفارتی محاذ پر سرگرم کوششیں سرانجام دے۔ رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ گروہ ان تمام ریاستوں پر مشتمل ہونا چاہئے جن کی سرحدیں عراق سے متصل ہیں، یعنی سعودی عرب، ترکی، اردن، شام اور ایران۔ نیز اس میں وہ ریاستیں بھی شامل ہوں گی جن کی سرحدیں تو عراق سے نہیں ملتیں لیکن وہ خطے میں اہم مقام رکھتی ہیں، جیسا کہ مصر، متحدہ عرب امارات اور اسی طرح کی دیگر ریاستیں۔ تاہم اس رپورٹ میں تمام ریاستوں میں سے ایران اور شام پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی ہے اور کہا گیا ہے: ''...امریکہ کو چاہئے کہ وہ ایران اور شام کے ساتھ براہِ راست مصروفِ عمل ہو، تاکہ عراق اور دیگر معاملات کے بارے میں مثبت اور تعمیری پالیسیوں کے متعلق ان ممالک سے حمایت حاصل کی جائے۔ شام اور عراق کے ساتھ مصروفِ عمل ہونے کے دوران امریکہ کو چاہئے کہ وہ ان ریاستوں کو اچھی آفر پیش کرنے اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں ممکنہ بُرے نتائج سے آگاہ کرنے کی پالیسی کو استعمال کرنے پر غور کرے، تاکہ تعمیری نتائج حاصل کیے جا سکیں ... ایران کے ساتھ مصروفِ عمل ہونے میں مسائل درپیش ہیں، بالخصوص امریکہ ایران تعلقات کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر۔ البتہ (اس بات کے پیشِ نظر کہ) امریکہ اور ایران نے افغانستان میں ایک دوسرے سے تعاون کیا تھا، دونوں فریقین کو چاہیے کہ وہ اس بات کا جائزہ لیں کہ عراق کے معاملے میں بھی اس ماڈل پر عمل کیا جا سکتا ہے یا نہیں''۔

2) رپورٹ میں عرب اسرائیل تنازعے کے حل کے لیے نئے سرے سے کوششیں شروع کرنے کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے: ''امریکہ مشرقِ وسطیٰ میں اپنے مقاصد اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ عرب اسرائیل تنازعے کے ساتھ براہِ راست نہ نبٹے ... امریکہ کی جانب سے عرب اسرائیل امن کے قیام کے لیے تمام محاذوں پر مسلسل مصروف رہنے کی ضرورت ہے، یعنی لبنان، شام اور صدر بش اسرائیل اور فلسطین کے لیے دو ریاستی حل پر کاربند رہیں گے، جس کے متعلق صدر بش نے جون 2002 میں بات کی تھی۔ اس کمٹ منٹ میں یہ شامل ہونا لازمی ہے کہ اسرائیل، لبنان اور اہلِ فلسطین (جو اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسرائیل کو باقی رہنے کا حق حاصل ہے) کے ساتھ براہِ راست مذاکرات کیے جائیں اور ان سب کے مابین بھی براہِ راست مذاکرات ہوں''۔ رپورٹ میں مزید بیان کیا گیا ہے: ''اس کوشش میں اس بات کا شامل ہونا لازمی ہے کہ جس حد تک ممکن ہو سکے جلد از جلد اسرائیل، لبنان اور شام کے درمیان نیز اسرائیل اور ان فلسطینیوں کے درمیان، جو اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسرائیل کو باقی رہنے کا حق حاصل ہے، غیر مشروط ملاقاتیں بلائیں جائیں اور ان کے انعقاد کو یقینی بنایا جائے، اور یہ ملاقاتیں اقوام متحدہ کی چھتری تلے ہوں یا پھر یہ ملاقاتیں اِن چار اراکین کے زیرِ نگرانی کی جائیں: امریکہ، روس، یورپی یونین اور اقوامِ متحدہ۔ ان ملاقاتوں کا مقصد امن پر ایک دوسرے سے مذاکرات کرنا ہوگا، جیسا کہ 1991 میں میڈرڈ کانفرنس میں کیا گیا تھا... جہاں تک شام کا تعلق ہے تو امن مذاکرات کا ایک حصہ یہ ہونا چاہئے کہ شام حماس اور حزب اللہ پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے اسرائیل کی دفاعی فورس کے سپاہیوں کو اِن تنظیموں سے رہائی دلوائے اور اس بات کی ذمہ داری اٹھائے کہ وہ اسرائیل کے باقی رہنے کے حق کو حماس سے تسلیم کرانے میں مدد دے گا اور یہ کہ شام حزب اللہ کو اسلحے کی سپلائی ختم کر دے گا... علاوہ ازیں شام اقوامِ متحدہ کی قرارداد نمبر 1701 کی مکمل پاسداری کرے گا اور لبنان میں کیے جانے والے سیاسی قتل کی وارداتوں کی ہر تفتیش میں تعاون کرے گا... اور ان اقدامات کے بدلے میں نیز مکمل اور پائیدار امن معاہدے کی روشنی میں اسرائیل گولان کی پہاڑیاں شام کو واپس کر دے گا۔ اور اس کے ساتھ اسرائیل کو امریکہ کی طرف سے تحفظ کی ضمانت حاصل ہوگی، یہ ضمانت سرحد پر بین الاقوامی فوج کی تعیناتی پر مشتمل ہو سکتی ہے اور اگر دونوں فریقین درخواست کریں تو اس میں امریکہ کے فوجی دستے بھی شامل ہو سکتے ہیں''

3) رپورٹ میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ امریکی افواج کی نئے سرے سے تعیناتی کیسے کی جائے گی، رپورٹ میں بیان کیا گیا:

- 2008 کے اختتام تک لڑاکا فورس کے بیشتر

حصے کو ہٹالیا جائے۔

• منتخب امریکی فوجی یونٹوں کو عراقی فوجی یونٹوں کے ساتھ رکھا جائے، جس کا مقصد انہیں تربیت دینا، انٹیلی جنس اکٹھا کرنا اور فضائی اور زمینی مدد فراہم کرنا ہوگا۔ علاوہ ازیں عراق کی مخصوص یونٹوں کو، جن کی تعداد اس وقت تین یا چار ہزار ہے، دس سے بیس ہزار تک بڑھایا جائے۔

• امریکی فوج کے ایک حصے کو سٹینڈ بائی کے طور پر محفوظ رکھا جائے تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورتِ حال میں اسے استعمال کیا جا سکے، بالخصوص عراق میں القاعدہ کے خلاف فوجی آپریشن پر عمل درآمد کرنے کے لیے۔

• عراق میں ایف بی آئی کی موجودگی کو برقرار رکھا جائے، نیز اس کے دفاتر اور دہشت گردی سمیت مختلف تفتیشی شعبوں کی تعداد کو بڑھایا جائے۔

رپورٹ میں مزید بیان کیا گیا ہے: ''عراق سے اپنے تمام لڑاکا فوجی دستوں کو نکالنے کے بعد بھی ہم خطے میں خاطر خواہ فوجی موجودگی برقرار رکھیں گے۔ ایسا عراق میں ہماری فوجوں کی بدستور بڑی تعداد میں موجودگی نیز کویت، بحرین اور قطر میں بری، بحری اور فضائی فوج کی بھاری تعداد اور افغانستان میں افواج کی تعداد کو بڑھانے کے ذریعے ہوگا...''

یہ وہ نمایاں ترین پراجیکٹ ہیں جن کی تجویز بیکر ہملٹن رپورٹ میں دی گئی ہے۔ اور یہ محض اتفاق نہیں کہ چند ماہ قبل تیار کی جانے والی یہ رپورٹ ایسے موقع پر جاری کی گئی ہے جب ''نئے مشرقِ وسطیٰ'' کے قیام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا امریکی منصوبہ ناکام ہو چکا ہے، جسے امریکہ جون کی جنگ کے ذریعے پورا کرنا چاہتا تھا۔ یہ رپورٹ امریکہ کو دوبارہ اس کی راہ پر واپس لے آئی ہے، اور اب کی بار اسے ''فوجی لائحۂ عمل'' کی بجائے (جسے امریکہ آزما چکا ہے اور اس میں ناکام ہو چکا ہے) ''سفارتی لائحۂ عمل'' کا نام دیا جا رہا ہے۔

کافر استعماری طاقتیں اپنے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کئی اسلوب اور ذرائع بروئے کار لاتی ہیں، جس میں فوجی، اقتصادی اور سیاسی الغرض ہر طرح کے اسلوب و ذرائع شامل ہیں۔ اور اگرچہ کافر استعماری طاقتیں اِن میں سے کچھ ذرائع کو خوشنما نام دے دیتی ہیں، جیسا کہ اس رپورٹ میں کچھ اسالیب کو خوشنما الفاظ کا لبادہ پہنایا گیا، تاہم یہ تمام کے تمام امتِ مسلمہ کے لیے ہلاکت خیز ہیں۔

اے مسلمانو!

یہ رپورٹ اپنے اندر اِن دو جرائم کو سموئے ہوئے ہے: اول: یہ رپورٹ عراق کے قریب اور دُور واقع مسلمان ریاستوں کو عراق میں موجود امریکی فوجیوں کے لیے دفاعی حصار کی شکل دینا چاہتی ہے، یعنی یہ ریاستیں اُن مسلمانوں کا سامنا کریں جو کہ حملہ آور افواج کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں۔ یوں امریکی فوجیوں کی جان بچانے کے لیے مسلمانوں کا خون بہایا جائے گا تاکہ امریکی فوجی خیر و عافیت کے ساتھ اپنے بیوی بچوں کے پاس واپس پہنچ جائیں اور ان کے گھر والوں کو تابوتوں میں بند لاشیں نہ دیکھنی پڑیں۔ دوم: اس رپورٹ نے مسلم علاقوں اور ان میں بسنے والے لوگوں کی فروخت کے لیے ازسرِ نو مذاکرات کے فضا قائم کر دی ہے۔ یعنی علاقے کے مسلمانوں اور ارد گرد کے منافق حکمرانوں سے اسرائیل کو کھلم کھلا طور پر تسلیم کروا کر فلسطین پر مکمل کنٹرول قائم کیا جائے۔ اور اس بات سے قطع نظر کہ یہ حکمران اپنے آپ کو مزاحمتی ریاستیں کہتے ہیں یا نہیں، یہ ریاستیں اسرائیل کے ساتھ خفیہ مذاکرات اور خفیہ طور پر اسرائیل کو تسلیم کرنے کو لوگوں کے سامنے بیان کر دیں۔ اسی طرح فلسطین کی مزاحمتی تنظیموں سے اسرائیل کو تسلیم کروایا جائے، قطع نظر یہ کہ آیا یہ تنظیمیں اسلامی ہیں یا سیکولر۔ اور یہ تنظیمیں اس بات کو تسلیم کر لیں اور اس بات کا اعلان کر دیں کہ مسئلہ اس علاقے کا ہے جس پر 1967 میں قبضہ کیا گیا۔ اور جو قبضہ اس سے قبل ہوا تھا، اُسے دفن کر دیا جائے۔

بیکر ہملٹن رپورٹ میں شامل یہ پالیسی اس قدر خطرناک ہے کہ مسلمانوں کے لیے بالکل جائز نہیں کہ وہ اس سے غفلت برتیں۔ اگر مسلمان اپنے حکمرانوں کو اس بات کی کھلی چھوٹ دے دیں کہ وہ امریکہ کے تحفظ کے لیے اپنی افواج تعینات کریں اور امریکہ کو عراق کی دلدل سے رفتہ رفتہ باہر نکلنے کی نگرانی کریں، تو عراق میں امریکہ کا اثر و رسوخ پھلنے پھولنے لگے گا، اس کی افواج مضبوط ہو جائیں گی، اس کی انٹیلی جنس عراق میں اپنے قدم مستحکم کر لے گی اور اس کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا، اور اسکی ایمبیسی فورسز سکون اور آرام کے ساتھ، جیسے چاہیں گی کاروائیاں کریں گی۔ اگر مسلمان اپنے حکمرانوں کا احتساب نہیں کریں گے اور ان کی مذمت نہیں کریں گے اور انہیں ہٹانے کی جد وجہد نہیں کریں گے تو حکمران اور عوام دونوں ڈوب جائیں گے۔ اگر مسلمان سپاہیوں نے اس بات پر قناعت اختیار کر لی کہ وہ امریکی افواج کے لیے ڈھال کا کام دیں، بجائے یہ کہ وہ ان امریکی افواج کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ بنیں جو انہیں ہر طرف سے گھیر لے اور عراق کے لوگوں کو فتح سے ہمکنار کرے اور عراق کو حملہ آور کفار کے اثر و رسوخ سے نجات دلائے... پس اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے پر مطمئن ہو گئے تو امتِ مسلمہ ذلت و رسوائی میں گھر جائے گی۔ ان افواج کا یہ جرم ایک عظیم جرم ہوگا اور اس کی سزا بھی اتنی ہی دردناک ہوگی، کیونکہ وہ استطاعت رکھتے ہیں اور وہ عام لوگوں سے زیادہ صورتِ حال کو تبدیل کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔

اے مسلمانو!

ہر آنے والا دن اس حقیقت کو مزید واضح کر رہا ہے کہ امریکہ بشمول مغرب اپنے تمام تر اسلحے اور جدید ہتھیاروں سے لیس ہونے کے باوجود مسلمانوں کے اندر موجود ایجنٹوں کے بغیر مسلمان علاقوں میں اپنی موجودگی کو مستحکم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اس امر کے باوجود کہ برطانیہ کو فلسطین پر عملداری حاصل تھی اور اس نے دنیا کے ہر کونے سے یہودیوں کو فلسطین کی سرزمین پر اکٹھا کیا تھا، وہ 1948 کی جنگ میں فلسطین کو سر کرنے میں ناکام رہا۔ اور اگر عرب حکمران غداری نہ کرتے، جنہوں نے اپنی سات افواج کو فلسطین کو بچانے کے بہانے روانہ کیا، مگر دراصل وہ فلسطین کو کفار کے حوالے کرنے اور پسپائی کو اختیار کرنے کی سازش کر چکے تھے، تو آج فلسطین کی سرزمین پر اسرائیل کا وجود نہ ہوتا۔ پھر جب عرب حکمرانوں کی غداری بے نقاب ہوگئی اور ان سے لوگوں کا اعتماد اُٹھ گیا تو سیکولر تنظیموں کی بنیاد رکھی گئی، جنہوں نے لوگوں کے سامنے اعلان کیا کہ وہ 'نہر سے لے کر بحر تک' فلسطین کو آزاد کرائیں گی۔ تاہم آخر کار انہوں نے 'نہر اور بحر' دونوں اسرائیل کے حوالے کر دیے اور وہ فلسطین میں دو ریاستوں یعنی اسرائیل اور فلسطینی ریاست کے قیام پر راضی ہو

گئیں۔ اور قبل یہ کہ اسرائیل فلسطین کے مسلمانوں کے لیے فلسطین میں ایک ننھی سے ریاست کے قیام پر آمادہ ہوتا، انہوں نے فلسطین کے بڑے حصے پر یہودی ریاست کے قیام کو قبول کر لیا!

پھر جب ان سیکولر جماعتوں کی غداری بے نقاب ہوگئی اور لوگوں نے ان کے اس قول پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا کہ وہ فلسطین کو اسرائیل کے وجود سے نجات دلائیں گے، تو اسلامی تنظیمیں نمودار ہوئیں اور انہوں نے اعلان کیا کہ وہ 'نہر سے لے کر بحر تک' فلسطین کو آزاد کرائیں گی۔ تاہم ان کا انجام بھی اپنے پیش روؤں کا سا ہوا اور انہوں نے بھی دن دہاڑے اس بات کو قبول کر لیا کہ وہ 1967 کی سرحدوں میں ریاست کا قیام چاہتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ انہوں نے اسے عظیم اور باوقار فتح قرار دیا!

کیا اسرائیل یا امریکہ یا یورپ کبھی دو ریاستی حل کی تجویز پیش کرنے کی جرات کرتے، اگر انہیں فلسطین میں ایسے لوگ دستیاب نہ ہوتے، جو فلسطین کے ایک چھوٹے سے حصے پر کمزور فلسطینی ریاست کے بدلے فلسطین کا بیشتر حصہ یہودیوں کے حوالے کرنے کو قبول کر رہے ہیں؟!

اگر عراق اور افغانستان میں امریکہ کو ایک ایک کرزئی نہ ملتا تو کیا وہ ان علاقوں میں اپنے قدم جمانے کی کوشش کرتا؟!

لبنان میں امریکہ اور یورپ اپنے اپنے مفادات کی خاطر باہم کشمکش کر رہے ہیں اور لبنان کے لوگوں کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں جو ایک دوسرے سے جھگڑتے اور لڑتے ہیں، حتیٰ کہ ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ لبنان کے سیاست دان، خواہ وہ حکومت میں ہوں یا اپوزیشن میں، ایک ہی دائرے میں حرکت کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ باہر بیٹھے ہوئے اصل کھلاڑی یعنی امریکہ اور یورپ ایک حل پر متفق نہ ہو جائیں، جو ان کٹھ پتلی سیاست دانوں کے ذریعے نافذ کیا جائے گا۔

صومالیہ میں جب مسلمانوں نے اسلامی عدالتوں کی طرف رجوع کر لیا اور ان عدالتوں کی حمایت کی اور کسی خون خرابے کے بغیر انہیں حکومت میں آنے کی دعوت دی؛ اور قریب تھا کہ تمام کا تمام ملک اسلام کے نام پر ان عدالتوں کے گرد اکٹھا ہو جاتا، کہ امریکہ نے صومالیہ کے کرزئی عبداللہ یوسف کی درخواست پر عبوری حکومت کے قیام کو بہانہ بنایا اور سلامتی کونسل سے قرارداد حاصل کی تاکہ متحدہ افریقی فورسز کو بین الاقوامی افواج کی پیش رو کے طور پر، عدالتی فورس اور عبوری حکومت کی فورس کے درمیان ٹکراؤ کو روکنے کے بہانے، صومالیہ میں داخل کیا جائے۔ لیکن عبوری حکومت کی افواج دراصل کس کی افواج ہیں؟ عبداللہ یوسف کی حکومت امریکہ کی تخلیق کردہ ہے اور اگر اسے امریکی ایجنٹوں بالخصوص ایتھوپیا کی حکومت کی مدد حاصل نہ ہوتی تو یہ حکومت عملی طور پر مردہ ہو چکی ہوتی۔ اگرچہ صومالیہ کی اسلامی عدالت کی عسکری طاقت قلیل ہے لیکن امریکہ اس قابل نہ تھا کہ وہ اپنی فوج صومالیہ میں داخل کرتا۔ اور اُس نے صومالیہ کے اندر اور باہر موجود اپنے ایجنٹوں کو استعمال کیا۔ پس سوڈان نے امن اور مذاکرات کے نام پر مداخلت کی، ایتھوپیا نے جنگ اور سازشوں کے ذریعے امریکہ کو مدد فراہم کی اور صومالیہ میں موجود امریکہ کے کٹھ پتلی حکمران عبداللہ یوسف کے نام پر ایک قرارداد منظور کی گئی۔ برطانیہ نے بھی یہی رستہ اختیار کیا اور یمن میں اپنے ایجنٹوں کو اُکسایا، تاکہ وہ برطانیہ کے لیے راہ بنائیں تاکہ برطانیہ بھی اپنا نیزہ صومالیہ کی پشت میں گھونپ دے۔

اسی طرح ان کٹھ پتلی حکمرانوں کے مدد و تعاون کے بغیر، کفار استعماری ریاستیں اپنے تمام تر ہتھیاروں اور جدید اسلحے کے باوجود تمام مسلمان کالونیوں میں قدم نہیں جما سکتے۔ یہ حکمران استعماری ریاستوں کے اشارے پر متحرک ہوتے ہیں اور چند روز کی دنیا کی خاطر اپنا دین بیچ دیتے ہیں بلکہ یہ تو غیروں کی دنیا کی خاطر اپنا دین بیچ دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ایک ایسا شخص ہی انکار کر سکتا ہے، جس کی آنکھیں اور دل اندھے ہو چکے ہوں۔ ﴿...الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ﴾ ''...وہ بہرے اور گونگے، جو کچھ عقل نہیں رکھتے'' (الانفعال: 22)

اے مسلمانو!

بیکر ہملٹن رپورٹ عراق کے نزدیک اور دور کے مسلمان ممالک کے حکمرانوں کو متحرک کرنے کا عندیہ دے رہی ہے کہ وہ مصیبت میں پھنسی ہوئی امریکی فوج کا اولین دفاعی حصار بن جائیں اور حملہ آور کفار کو قتل کرنے کی بجائے اپنے مسلمان بھائیوں کا ہی خون بہائیں۔ یہ رپورٹ ہمیں بش سینئر کی یاد دلاتی ہے، جس نے عرب حکمرانوں کو متحرک کیا تاکہ وہ خلیج کی دوسری جنگ میں امریکہ کی مدد کے لیے اپنی افواج تعینات کریں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ((**انی بری ء من کل مسلم مع مشرک ثم قال رسول اللّٰہ ألا لا تراء ی ناراهما**)) ''میں ان تمام مسلمانوں سے بری الذمہ ہوں جو مشرک کا ساتھ دیں۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا: خبردار ان کی قوتیں ایک ساتھ اکٹھی نہ ہوں'' یعنی وہ جنگ میں اکٹھے مل کر نہ لڑیں۔

اگرچہ یہ رپورٹ ایسی گزرگاہوں سے پُر ہے جو آگ کی طرف لے جاتی ہیں، لیکن مسلمان حکمرانوں نے اپنے آپ کو اس کام کے لیے موزوں اور تیار ثابت کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ بے شک شام کی حکومت تو اسی رپورٹ کی دُھن پر محوِ رقص ہے۔

اے مسلمانو!

حزب التحریر حکمرانی اور اقتدار کے حامل ہر شخص کو سختی سے تنبیہ کرتی ہے کہ وہ امریکہ کو بچانے کے لیے اس کی مدد کرنے یا اُس کی طرف مذاکرات کے لیے ہاتھ بڑھانے یا فلسطین کے ایک انچ پر بھی اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنے سے باز رہیں۔ وہ انہیں اللہ اور اللہ کے غلاموں کے غیض و غضب سے خبردار کرتی ہے۔ کیونکہ جب اِن غداریوں کی سزا آن پہنچے گی تو اُنہیں دنیا اور آخرت کی ذلت و رسوائی اور بھیانک انجام سے کوئی بچا نہیں سکے گا، نہ امریکہ، نہ یورپ اور نہ ہی اسرائیل۔ بلکہ ان حکمرانوں کی حالت ویسی ہی ہوگی جیسے شیطان کے ان پیروکاروں کی حالت، کہ جس کے متعلق قرآن کہتا ہے: ﴿كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنسَانِ اكْفُرْ ۖ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكَ...﴾ ''جیسے کہ شیطان کی مثال ہے، جب وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کرو۔ تو جب انسان نے کفر کیا تو شیطان نے کہا کہ میں تم سے بَری الذمہ ہوں...'' (الحشر: 16)

﴿هٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَ لِيُنْذَرُوْا بِهٖ﴾
''یہ لوگوں کے لیے کھلا بیان ہے، تاکہ اس کے ذریعے لوگوں کو خبردار کر دیا جائے''

۱۷ ذیقعدہ ۱۴۲۷ھ
8 دسمبر 2006ء

حزب التحریر

❁❁❁

مشرف کی 'کچھ لو اور کچھ دو' پالیسی

کئی سالوں سے ہمیں بار بار یہ یقین دلایا جا رہا ہے کہ امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی شمولیت ہمارے اپنے مفاد ہے اور یہ ہماری اپنی سلامتی اور خوشحالی کی جنگ ہے اور یہ جنگ شر اور ظلم و ناانصافی کے خلاف ہے۔ اور جب بھی اِس امریکی جنگ کے نتیجے میں پاکستان کو کوئی بھاری نقصان پہنچتا ہے تو امریکہ فوری طور پر پاکستان کے مسلمانوں کے ساتھ اظہارِ افسوس کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ امریکہ کے ساتھ حکومتِ پاکستان کے اتحاد کی تعریف کرنا نہیں بھولتا۔

پس باجوڑ پر حملے کے بعد، جس میں 83 اساتذہ اور طالبعلم شہید ہوئے، امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ترجمان سین میک کورمیک (Sean McCormack) نے 31 اکتوبر 2006 کو یہ بیان دیا: ''پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ میں انتہائی اہم اتحادی ہے... امریکہ کو اس دہشت گردی کے خلاف جنگ میں معصوم شہریوں کی ہلاکت پر افسوس ہے'' پھر جب درگئی میں 42 پاکستانی فوجیوں کا قتل ہوا تو امریکی وائٹ ہاؤس کی قومی سلامتی کونسل کے ترجمان گورڈن جان ڈرو نے 8 نومبر 2006 کو یہ بیان جاری کیا: ''ہم ہلاک ہونے والوں کے اہلِ خانہ اور رفقاء سے گہرے افسوس کا اظہار کرتے ہیں... اور ہم دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی حکومت کے عزم و استقلال کو تحسین کی نظروں سے دیکھتے ہیں''

لیکن امریکہ کے افسوس کرنے یا تعریفیں کرنے سے کیا حاصل، جب ہم نے ابتداء سے ہی مسلمانوں کے خلاف اس امریکی جنگ میں ہمیشہ نقصان اٹھایا ہے! امریکہ کے ساتھ پاکستانی حکومت کے اتحاد کی حقیقت یہ ہے کہ یہ اتحاد 'لو اور دو' پر مشتمل ہے جس میں پاکستان کی حکومت نے ہمیشہ عطا کرنا ہے اور استعماری مغرب نے ہمیشہ وصول کرنا ہے۔ جب جنرل پرویز مشرف نے 2001ء میں اس امریکی جنگ میں ساتھ دینے کا اعلان کیا تھا تو امریکہ نے فی الفور ہمارے وسائل کو استعمال کرنا شروع کر دیا: یعنی ہماری ائر بیس، ہماری انٹیلی جنس، ہماری فضائیں اور زمینی راستے؛ تاکہ افغانستان میں موجود ہمارے مسلمان بھائیوں پر ظالمانہ حملے کی شروعات کی جا سکے۔ پاکستان کے حکمران کی اس غداری اور دستبرداری کے نتیجے میں ہی امریکہ کے اعتماد میں اضافہ ہوا اور اس نے اپنے اگلے ہدف پر نظریں جمانا شروع کر دیں۔ امریکہ کی اس جنگ کے نتیجے میں اس خطے میں پیدا ہونے والے شدید انتشار نے ہماری معیشت کو شدید زک پہنچائی، علاوہ ازیں افغانستان کے مسلمان بھائیوں کے قتلِ عام نے خطے کے تمام لوگوں کے ذہنی سکون کو برباد کر کے رکھ دیا۔ پھر امریکہ نے افغانستان میں ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کردی جس نے پاکستان اور افغانستان کے مابین نفرت اور دشمنی کی آگ کو بھڑکانا شروع کر دیا، مزید برآں اس حکومت نے اپنے دروازے ہندو ریاست کے لیے کھول دیئے تاکہ وہ اس خطے میں اپنے اثر و رسوخ میں اضافہ کر سکے۔ پھر جب امریکہ کے فوجیوں کو، جو اپنی بزدلی میں مشہور ہیں، قبائلی علاقوں میں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو امریکہ نے اس بات پر اصرار کیا کہ قبائلی علاقوں میں پاکستان اپنے فوجیوں کو تعینات کرے جو امریکہ کی خاطر بے گناہ قبائلی مسلمانوں کا خون بہائیں۔

علاوہ ازیں امریکہ نے پاکستان کے ساتھ اتحاد کو ہماری معیشت کو کمزور کرنے کے لیے بھی استعمال کیا۔ امریکہ کی استعماری پالیسی کی بنیاد یہ ہے کہ پہلے قرضوں میں ڈبو کر ہماری معیشت کو کنگال کر دیا جائے اور پھر ہمارے وسائل کو لوٹنے اور ہماری پیداوار اور تجارت پر تسلط جمانے کے لیے اپنی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو سرمایہ کاری کے نام پر ہمارے ملک میں داخل کیا جائے۔ ترکی، ارجنٹائن، فلپائن اور دیگر ممالک میں جو کچھ ہوا، وہ اس بات کی واضح مثال ہے کہ کس طرح یہ اقتصادی معاہدے وسائل سے مالا مال ممالک کو مفلس اور بھکاری بنانے کے مقصد کو پورا کرتے ہیں، اور ان ممالک کو اپنے وسائل کو اپنے اوپر خرچ کرنے سے باز رکھتے ہیں۔

نیز امریکہ نے اپنے اس اتحاد کو ہمارے عقائد اور اقدار پر ضرب لگانے کے لیے بھی استعمال کیا۔ دہشت گردی کی بنیادی وجوہات کا سدِ باب کرنے اور دنیا کے سامنے پاکستان کا ''نرم چہرہ'' پیش کرنے کے نام پر پاکستانی حکومتی ادارے اور امریکہ کی ملٹی نیشنل کمپنیاں ثقافتی میلوں اور تعلیمی اصلاحات کے ذریعے نہایت شد و مد سے کرپٹ مغربی اقدار پھیلا رہی ہیں، جن کے ذریعے مسلمان نوجوانوں کو فحاشی اور منکرات کی دلدل میں دھکیلا جا رہا ہے۔

یہ بات طے ہے کہ امریکہ ایک کافر، استعماری اور دشمن قوم ہے۔ وہ ہمارے معاملات پر غلبے کو ہم پر حملہ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس کی دشمنی کی کوئی انتہاء نہیں جیسا کہ ہم افغانستان اور عراق میں دیکھ چکے ہیں، اور اس کے علاوہ ابو غریب جیل، گوانتاناموبے اور بگرام کی مثالیں ہماری نظروں سے

حقیقت یہ ہے کہ یہ اتحاد 'لو اور دو' پر مشتمل ہے جس میں پاکستان کی حکومت نے ہمیشہ عطا کرنا ہے اور استعماری مغرب نے ہمیشہ وصول کرنا ہے

گزر چکی ہیں۔ یہ بات اب روزِ روشن کی طرح عیاں ہوچکی ہے کہ امریکہ ہمیں دشمن کی نظر سے دیکھتا ہے اوراب وہ اپنے سفاک چہرے کو انسانی حقوق، مساوات اور امن جیسے خوبصورت الفاظ کے پردے میں چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ کفار کی ان دلی خواہشوں کو کئی صدیوں پہلے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو آگاہ فرمادیا تھا کہ:

﴿مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾

''کافروں میں سے نہ تو اہلِ کتاب اور نہ ہی مشرکین اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو'' (البقرہ: 105)

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مسلمانوں کو قطعاً اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار کو اپنا اتحادی بنائیں، اور اللہ تعالیٰ نے کفار کے ساتھ ایسے اتحاد کو عظیم منکر قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا:

امریکہ ہمیں دشمن کی نظر سے دیکھتا ہے اور اب وہ اپنے سفاک چہرے کو انسانی حقوق، مساوات اور امن جیسے خوبصورت الفاظ کے پردے میں چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتا

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا﴾

''اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست مت بناؤ، کیا تم اللہ کے سامنے اپنے ہی خلاف کھلی دلیل پیش کرنا چاہتے ہو'' (النساء: 144)

یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے الفاظ ہیں جن میں جھوٹ نہ آگے سے داخل ہوسکتا ہے اور نہ ہی پیچھے سے۔ ان الفاظ پر ہمارا ایمان ہے اور ان کی تلاوت کے ذریعے ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اور منکر ہماری نظروں کے سامنے ہو رہا ہے، تو پھر کیوں ہم اس منکر پر خاموش رہ کر اور اس منکر کی پیروی کر کے اور اس کا انکار نہ کر کے قیامت کے دن اپنے ہی خلاف دلیل پیش کرنے کی جرأت کریں؟

یہاں افواجِ پاکستان کو مخاطب کرنا بہت ضروری ہے کہ تم محمد بن قاسم کی اولاد ہو، جس نے مظلوم مسلمانوں کی آواز پر لبیک کہا، تم خالد بن ولید کی اولاد ہو جس نے عرب وعجم کو شکست دی، تم صلاح الدین ایوبی کی اولاد ہو جس نے صلیبیوں کے قبضے کا خاتمہ کیا۔ تو پھر کس طرح تم اس بات کو قبول کرتے ہو کہ تم استعماری کفار کی خاطر اپنا خون بہاؤ اور کفار کے قبضے کو مزاحمت کرنے والے مسلمانوں سے محفوظ بنانے کے لیے اپنی جانیں قربان کرو؟ رسول اللہ ﷺ نے تو ہمیں حکم دیا ہے:

((المسلم اخو المسلم لا يخونه و لا يكذبه و لا يخذله. كل المسلم على المسلم حرام عرضه و ماله و دمه. التقوى ها هنا. بحسب امرى من الشر ان يحتقر اخاه المسلم))

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اپنے بھائی سے غداری نہیں کرتا، نہ ہی اس سے جھوٹ بولتا ہے اور نہ ہی اس کا ساتھ چھوڑتا ہے۔ مسلمان کی عزت، اس کا مال اور اس کا خون دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ تقوی یہاں ہے (رسول اللہ ﷺ نے سینے کی طرف اشارہ فرمایا)۔ ایک مسلمان (کو ہلاک کرنے) کے لیے اتنی برائی ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے'' (ترمذی)

مشرف کی 'کچھ لو اور کچھ دو' پالیسی بہت واضح ہوچکی ہے۔ پاکستان کے مسلمان بہت کچھ دے چکے ہیں اور امریکہ بہت کچھ لے چکا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم اس 'دوستی' کو سمجھیں اور اس کا انکار کردیں۔ ہمیں ظالم کا ہاتھ روکنا ہوگا اور دہشت گردی کے خلاف اس نام نہاد جنگ میں استعماری کفار کے ساتھ تباہ کن اتحاد کو ختم کر دینا ہوگا، یہ جنگ دراصل ''مسلمانوں کے خلاف'' اور ''اسلام کے خلاف'' ہے۔

بے شک اللہ نے ان لوگوں کے لیے عظیم اجر تیار کر رکھا ہے جو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((ان من امتي قوما يعطون مثل اجور اولهم ينكرون المنكر))

''بے شک میری امت میں ایسے لوگ آئیں گے جنہیں منکر سے روکنے کا اجر میری امت کے اولین لوگوں کی طرح دیا جائے گا'' (مسند احمد)

❁❁❁

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''سات طرح کے لوگوں کو اللہ اپنے سائے میں پناہ دے گا، اس دن جب اللہ کے سائے کے سوا اور کسی کا سایہ نہ ہوگا: عادل امام، اور وہ نوجوان جس کی پرورش اللہ عزوجل کی عبادت میں ہوئی، اور وہ شخص جس کا دل ہر وقت مسجد میں اٹکا رہتا ہے، اور وہ دو شخص جو محض اللہ کی خاطر آپس میں ملتے ہیں اور اسی کی خاطر ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں، اور وہ شخص جسے اچھے حسب ونسب کی خوبصورت عورت (زنا کی) طرف بلائے اور وہ شخص کہے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں، اور وہ شخص جو خفیہ طور پر صدقہ دے حتیٰ کہ اس کے بائیں ہاتھ کو یہ علم نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا اور وہ شخص جو خلوت میں (یا کسی پریشانی کے بغیر) اللہ کو یاد کرے اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئیں''

(متفق علیہ)

کیمرے کی آنکھ سے

پشاور میں حزب التحریر کے زیر اہتمام سیمینار سے حزب کے رکن عبدالبصیر خطاب کر رہے ہیں

لندن میں 'اسلام چینل کانفرنس 2006' میں حزب التحریر کی طرف سے لگائے گئے سٹالز کے مختلف مناظر

بنگلہ دیش میں حزب التحریر کی طرف سے نکالی گئی ریلی سے حزب کے ارکان خطاب کر رہے ہیں

نظامِ خلافت کا سائباں دے دو

میری زمیں کے ستاروں کو آسماں دے دو
میرے فلک کے نظاروں کو کُل جہاں دے دو

شام جان و روح و دل کو معطر کر دیں
انہی ہواؤں کو گل گشتِ بے کراں دے دو

نظام ہستی دنیا اسی ڈگر پہ چلے
کہ راہنمائے حقیقی کو اکرواں دے دو

یہی ہے ذریعہ نجاتِ امتِ وسطیٰ
کہ بیعت ایک خلیفہ کو بے گماں دے دو

یہی ہے معنیٰ کلام ہادیٔ برحقؐ
جو ہوں اہل، امانتوں کو وہ نگراں دے دو

یہ ایک شخص نہیں ایک نظامِ کامل ہے
دکھے ہوئے دلوں کو درد کا درماں دے دو

خلیفہ وحدتِ امت کا نقش ثانی ہے
غلام دنیا کو نظام جاوداں دے دو

سکونِ قلب و اطمینان کھو چکا انساں
انہیں کو حاملِ قرآن و خود قرآں دے دو

جو مشتِ خاک ہوئے، خانماں لٹا جن کا
انہیں نظام خلافت کا سائباں دے دو

چلو کہ لوٹنے والی ہے عظمتِ رفتہ
صدائے اللہ اکبر پہ روح و جاں دے دو

اُمِّ مصعب